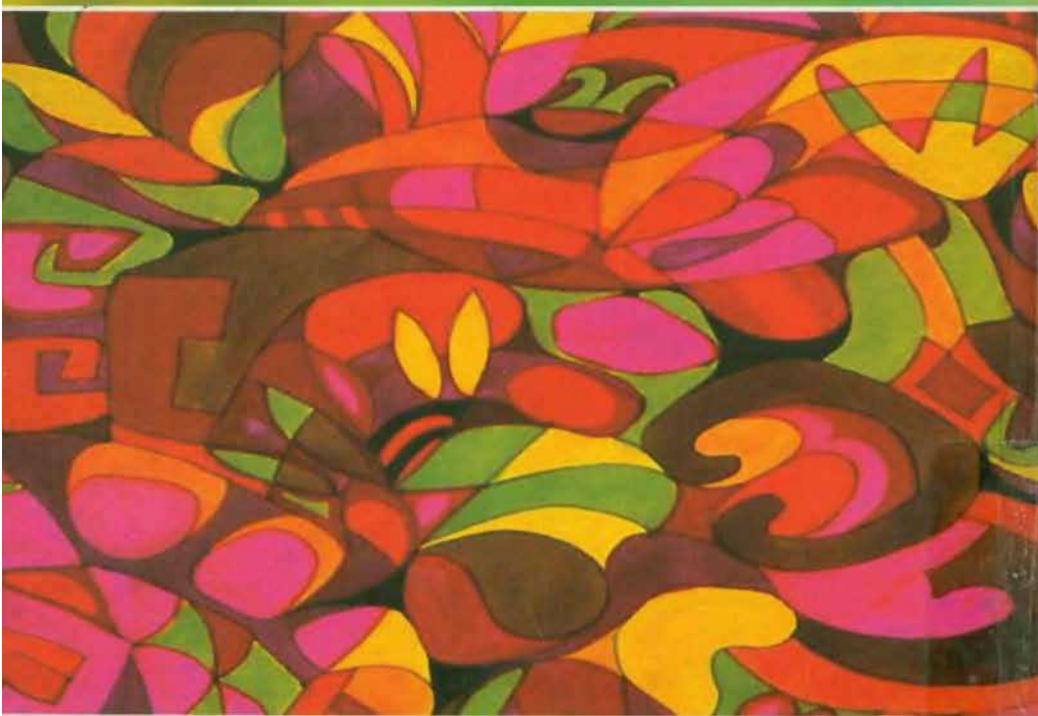


قتیل شفائی

برگرد

غزل، نظم، دوبہ، رباعی، خماسی



ہرگز

غزل ، نظم ، دوہا ، رباعی ، خماسی



سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

2004

نسیہ زامہ نے

اسین کیو پر نثر، لاہور سے چھپوا کر

سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد — ایک ہزار

قیمت ۳۰۰/۰۰ روپے



ISBN - 969 - 35 - 0636 - 7

مرحوم بہن کے نام

جس کے پیار کے برابر کسی بھائی کو
اپنی بہن کا پیار نہ مل سکا ہوگا

بیوی کے نام

جس کا زندگی بھر کا بے نام و نشان
ایشیاد، مر کے بھی نہ بھٹا سکوں گا

ترتیب

ابتدائیہ ۱۵

دعا ۱۷

روشنی، اسے روشنی ۱۹

جب بھی کتا ہوں کوئی تازہ غزل تیرے لیے ۲۱

تیری راہوں میں بھٹکنے کے لیے زندہ ہوں ۲۳

شعر ۲۵

راکھ ۲۶

سُودج مرے دل میں جل رہا ہے ۲۷

زخموں کو گلاب بکھ رہے ہیں ۲۹

بانجھ موسموں کی راگنی ۳۱

دُنیا مری آباد ہے جس راحتِ جاں سے ۳۳

ردِ شبنم وہ مرا گوشتِ تنائی تو کر جائے ۳۵

عصبت ۳۷

جسوریت ۳۸

گئے برس جو گیتِ سنا تھا ہر بالے سادوں سے ۳۹

آنسو آنسو ہر قطرہ شبنم کا ہے ۴۱

جو خود اس کا رستہ رد کیں ان کے آگے بھٹکتی ہے ۴۳

شناخت ۴۵

سراپا غم ہیں اور وہ لگدانا چاہتا ہے ۴۷

دہ کھل کر اب کوئی جلوہ دکھانا چاہتا ہے ۴۹

ایفرو ایشیائی نغمہ ۵۱

سینے میں حسرتوں کی جن چاہتا نہیں ۵۳

یادِ کماں تک اور محبتِ نبھاؤں میں ۵۵

غبارِ بیٹھ گیا ۵۷

محبت ہو رہی ہے تازہ دم آہستہ آہستہ ۵۹

ہواؤں کی زبانی سُن لیا ہوگا ستاروں نے ۶۱

دفا کا بوجھ ہے سر پر مگر اُس کا یہ کہنا ہے ۶۳

کو کھ جلی ۶۵

جیسا اُس کے لیے سنا تھا دیا ہے ۶۷

گزارا ہے بیگانہ بن کر کیسا وہ ۶۹

لے گیا اپنی سب رکھائیں اپنے ساتھ ۷۱

سلسلہ خیالوں کا ۷۳

ٹوٹے گی دیوار ۷۵

اک بار جو تک لے اُسے نکلتا ہی چلا جائے ۷۷

بے ذوق تھی یا محض سے آگاہ تھی پہلے ۷۹

صحراؤں میں اک پھاؤں سی بکھراتی رہے گی ۸۱

دُرو اُس وقت سے ۸۳

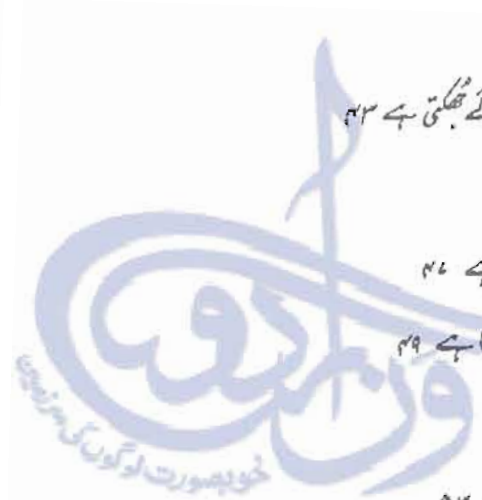
معراجِ نظر ۸۶

اپنے لبوں کو دشمنِ انہماست بنا ۸۷

رو کا ہے ٹوٹنے جس کو مدِ اعراضِ حال سے ۸۹

گریرِ مسرت ۹۱

آخر وہ میرے قد کی بھی حد سے گزر گیا ۹۳



کچھ راحتوں کی کھوج میں آئی تھی زندگی ۹۵

۹۶ اقرار

ہوا کی لہر کوئی چھو کے میرے یار سے آئی ۹۹

وہ سادہ جس میں زلفوں کی گٹھا چھائی نہیں ہوتی ۱۰۱

معجزہ ۱۰۳

کشتِ جمال ۱۰۴

دل لگا بیٹھا ہوں لاہور کے ہنگاموں سے ۱۰۵

جب کسی جام کو ہونٹوں سے لگایا میں نے ۱۰۷

جب سے آیا ہے ترے پیار کا موسمِ جاناں ۱۰۹

اب اور تب ۱۱۱

خود فریبی ۱۱۲

دستِ عوام ہو کر گریبانِ شہر ۱۱۳

جب سے لبوں پہ شورِ گلو تپنے لگا ۱۱۵

شہرِ آشوب ۱۱۷

ہر نئے سورج کی رہ رہ کر پذیرائی کریں ۱۱۹

کون کس کے ہاتھ آیا اور کھلونا ہو گیا ۱۲۱

اپنی اپنی سوچ کے صحرانوں میں ۱۲۳

کیڑا، برزق اور پیٹھر ۱۲۵

وہ شخص جس کو مری زندگی میں آنا تھا ۱۲۷

نہ دلوں نے وہ رہے اور نہ وہ زمانہ رہا ۱۲۹

اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کتا ہے ۱۳۱

لفظوں کی بائنی کا سانپ ۱۳۳

ہر دم ترے ہاتھوں کو پھوموں تیری بیعت چاہوں ۱۳۵

چاند بھی راہ میں کیا ہے روشن پھر بھی کوئی نہ آیا ۱۳۷

خون کی دستک ۱۳۹

زلزلے ۱۴۲

امیری کے نشان سارے کے سارے بر محل رکھنا ۱۴۳

اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا ۱۴۵

ایک انوکھی لڑکی ۱۴۷

اُس کی زلف کے سائے سائے چلا کرو ۱۴۹

اس دھرتی کے سفیش ناگ کا ڈنک بڑا زہریلا ہے ۱۵۱

یوں لگتا ہے لاش ہمارى موم کا پسے ہوئے کفن ہے ۱۵۳

نیلی روشنیاں ۱۵۵

دین بے وجود ۱۵۶

کچھ ذی ہنر جو بے ہنر کی طرح جیسے ۱۵۷

افشائیں اک بھلک میں کہانی وہ کر گیا ۱۵۹

ردِ نعمت ۱۶۱

تحفظ ۱۶۲

غبارِ رہزرجب پردہ محفل پہ گر تہا ہے ۱۶۳

منردی چیز جو مانگو وہی اکثر نہیں دیتا ۱۶۵

کہانی ختم ہوئی ۱۶۷

چمک آتی ہے آنکھوں میں کبھی کچھ سائے آتے ہیں ۱۷۱

اگر وہ شخص خود چل کر تھارے پاس آیا ہے ۱۷۳

ہوم سیک (HOME SICK) ۱۷۵

جو پل صراط بناتے ہیں رہزور کی جگہ ۱۷۷

غرض رہ کے بھی آنکھوں سے بات کرتا ہے ۱۷۹

احساب ۱۸۱

منزلِ مقصود ۱۸۲

شوقِ جلوہ ہے مگر ذوقِ نظر نابینا ہے ۱۸۳

کر رہے تھے قریہ قریہ زندگی کی جستجو، میں ادھر تو ۱۸۵

رُوبرُود ہے عبادت کرنا اہوں ۱۸۷

فلش بیک (FLASH BACK) ۱۸۹

ہاتھیوں کا لشکر ۱۹۲

پیتا ہے خون اپنا حالات کے مگوں میں ۱۹۳

کیا حسین آج ہے مگر قریب جائے کون ۱۹۵

دو عادتیں ۱۹۷

ایک گم گم فضا کے سوا کچھ نہ تھا میری چپ چاپ حیرانوں کے لیے ۱۹۹

باہر کی چمک بھی کیا کم تھی، پر بہت کچھ اُس کے اندر تھا ۲۰۱

گوئیے میرے شہر کے ۲۰۲

میں خدا سے کیا کہوں؟ ۲۰۳

شرمندہ انھیں اور بھی اے میرے خدا کر ۲۰۵

چھائی ہوئی گھنگھور گھٹا ہے ہرے سر پر ۲۰۶

شانزے یلے ۲۰۹

روشنی چاہیے صبا کے لیے ۲۱۳

جسم کے جزیرے میں یہ جو دل کی وادی ہے ۲۱۵

بے تعبیر ۲۱۷

اے کاش تھے ایسا اک زخمِ جدائی دوں ۲۱۹

دُنیا کو دکھانی ہے اک شکل خیالوں کی ۲۲۱

چاند، بڑھیا اور پتھر ۲۲۳

دن بھر ستانے کے لیے پیڑوں سے چھن کر آگئی ۲۲۵

یہاں ظلم بندوں پر جب ہو رہا تھا وہ کیوں چُپ رہا ۲۲۶

دو پا : ۲۲۹

رباعی : ۲۲۵

نظامی : ۲۹۱

رنگاں : ۲۶۵

○ مولانا صلاح الدین احمد ۲۶۶

○ فیض احمد فیض ۲۶۹

○ سائر لدھیانوی ۲۸۲

○ فکر تنسوی ۲۸۴

○ اکبر لاہوری ۲۸۶

استدائیہ

گھٹا چم چم بستی ہے، تو چڑیا چھپاتی ہے
مگر میں کیا کروں مجھ کو ہنسی دونوں پہ آتی ہے
کہ وہ اک لمحہ موجود کی جھوٹی گواہی پر
کبھی رو کر کبھی ہنس کر
غموں کا بھی خوشی کا بھی یقیں کرتی چلی جائیں

اگر چم چم بستی یہ گھٹا
اور چھپاتی ناچتی چڑیا
اجازت مجھ کو دے سکتیں۔

تو میں غم اور خوشی کے سارے موسم
اپنے بس میں کر کے دکھلاتا

میں ہر منظر میں

سب اسرار پس منظر کے دکھلاتا
کر میں انساں بھی ہوں

شاعر بھی ہوں

اور سوچتا بھی ہوں

بُٹھے تو آنسوؤں سے اور اپنے قہقہوں سے

مشیت کے خلاف اک اسلحہ خانہ بتانا ہے

نہیں آتا کسی کے تابع فرماں مجھے ہونا

میں خود مختار جینا چاہتا ہوں

میں خود مختار مرنا چاہتا ہوں

وَع

اے خدا اک ایسی تُو، مجھ کو زندگانی دے

جو مرے ارادوں کو، عُمرِ جاد دانی دے

بات، ابھی یہ کل کی ہے، میں تصاحف کا حاکم

کھوچکا ہوں میں جس کو، پھر وہ حکمرانی دے

آج بھی کھڑا ہوں میں، بچنے کی سرحد پر

تُو مری بلوغت کو، شعہ جواتی دے

چُپ ہوں ایک مدت سے، میری سوچ گڑبگڑ ہے

میری بے نوائی کو، تُو ہی کچھ معافی دے

روشنی، اسے روشنی

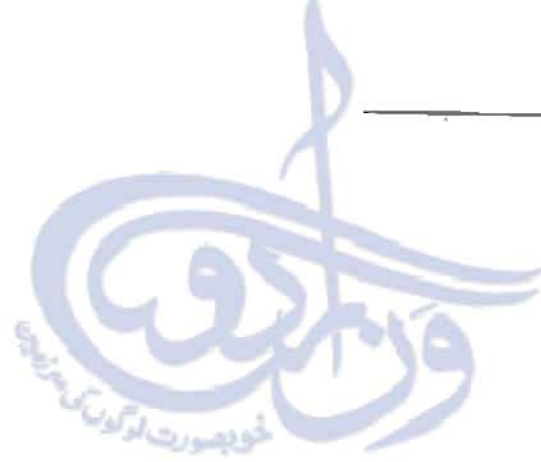
اسے روشنی، اسے روشنی
 بکرنوں کی پائل باندھ کر ، اس شہر میں چہم سے اُتر
 اسے روشنی، اسے روشنی
 مانا کر لمبی رات ہے ، اک خوف اس کے ساتھ ہے
 پر تو اندھیروں سے نہ ڈر
 اسے روشنی، اسے روشنی

مجھ کو خبر دی چاند نے ، تجھ کو یہ دھرتی بھبا گئی
 تو آسمانوں سے چلی ، اور میرے گھر تک آگئی
 بارے اندھیرے پھٹ گئے
 آنکھوں سے پردے ہٹ گئے
 جب سے بنی تو ہم سفر
 اسے روشنی، اسے روشنی

نفرتوں کا مارا ہوں ، عسقم کا استعارہ ہوں
 کم سے کم محبت کی ، مجھ کو ترجمانی دے

ہو مقابلہ میرا ، دشمنوں سے کیوں آخر
 بد زباں اگر وہ ہیں ، مجھ کو خوش بیانی دے

میں ققیل پہلے ہی ، قحط کا ستایا ہوں
 میرے کھیت پیاسے ہیں کوئی ان کو پانی دے



گھر کو کھلا رکھنا سدا ، میں نے اُجالوں کے لیے
 تو زندگی کی لہر ہے ، میرے خیالوں کے لیے
 شمعیں جلا اور اک میں
 تارے کھلا اس فاک میں
 جگمگ کریں دیوار و در
 اے روشنی اے روشنی

ہر میرے اس شہر میں ، کروے چراغاں چار سُو
 ایسا دکھا منظر کوئی ، سب کو ہے جس کی آرزو
 گلیوں کی رونق بن کے آ
 سب راستوں کو جگمگا
 سارے مکانات پر پکھر
 اے روشنی ، اے روشنی



جب بھی کہتا ہوں کوئی تازہ غزل تیرے لیے
 میرے احساس میں کھلتے ہیں کنول تیرے لیے

جاننا ہوں کہ مراد شبن جاں ہے پھر بھی
 دل کی ہر بات پہ کرتا ہوں عمل تیرے لیے

دشمنی یوں تو کسی سے بھی نہیں ہے میری
 صرت حالات سے ہے جنگ بدل تیرے لیے

آنکھ جنت ہے ہری اس کے کنارے آ جا
میں نے بنوایا ہے اک تاج محل تیرے لیے

اپنا گھر غور سے دیکھا ہی نہیں تُو نے ققیل
یہ تو دنیا میں ہے جنت کا بدل تیرے لیے



تیری راہوں میں بھٹکنے کے لیے زندہ ہوں
میں ازل ہی سے ترے حُسن کا بوئندہ ہوں

تیرے دل کی بھی نہ مل پائی مجھے شہریت
کس سے پوچھوں کہ میں کس ملک کا باشندہ ہوں

بھاگتے تھے تری آنکھوں کے سمندر جن کو
میں اُنہی دُربنے والوں کا نمائندہ ہوں



شعرا

جب اُس نے بنایا ہے مجھے بندہ بے دام
وہ خود ہی مرا کاتبِ تقدیر بھی ہوگا
اب ماتھ ملایا ہے جو اُس نے تو کسی دن
اللہ نے چاہا تو بعزلِ گیر بھی ہوگا

دیکھنا ہے تو مجھے ایک نظر دیکھ ہی لے
صبح کا تارا ہوں لیکن ابھی تابندہ ہوں

کسی جڑ سے میں سجایا نہ گیا جو مجھ سے
میں قنیل آج بھی اُس پھول سے شرمندہ ہوں





سُورج برے دل میں جل رہا ہے
یہ موم کا گھر گھس رہا ہے

اٹھا تھا دُھواں بس اک نکال سے
اب شر کا شہر جل رہا ہے

یہ شہر جو اب ہے نوحہ نوحہ
پہلے تو عنزل غزل رہا ہے

اُس گھر سے ہوائیں بے خبر ہیں
جس گھر میں چراغ جل رہا ہے

راکھ

تم کر چکے ہو مجھ سے ابھی جس کا تذکرہ
وہ تو کسی حسین پر مرنے کی عمر ہے
ہاں رکھ چکے ہیں جس میں قدم اب تم ادھر ہیں
یہ عمر سارے شہر سے ڈرنے کی عمر ہے

اس دھوپ میں یہ بھی ہے غنیمت
سایا فرے ساتھ چل رہا ہے

بن جائے نہ ایک روز ایسے صبح
بھ پڑ جو پھول پھل رہا ہے

کچھڑ میں تو پل رہی ہے دُنب
ادر پاؤں مرا پھسل رہا ہے

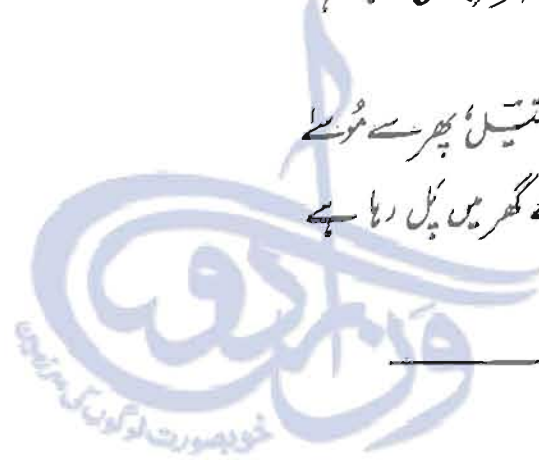
سُنتے ہیں قنیل، پھر سے مڑے
فرعون کے گھر میں پل رہا ہے



زخموں کو گلاب لکھ رہے ہیں
جیسے کوئی خواب لکھ رہے ہیں

پانی کو بن کے روشنیائی
شعلوں کا جواب لکھ رہے ہیں

ہم اپنی خوشی سے اپنے تن پر
موسم کا عذاب لکھ رہے ہیں



بانچھ موسموں کی راگنی

سنت بھی نہیں کہ حرف رنگ لوں
 پیلے پیلے رنگ میں
 بہار بھی نہیں کہ پھول ٹانگ لوں
 کسی نئی اُمنگ میں
 خزاں بھی وہ نہیں کہ خشک پتیاں
 اوس میں بھگو سکوں
 سماں بھی وہ نہیں کہ جس کی تلخیاں
 سرور میں ڈبو سکوں

وہ سامنے رکھ کے چمکتا کاغذ
 بارش کا حساب رکھ رہے ہیں

پڑھتے ہیں قتیّل ہم تو چہرے
 اور آپ کتاب رکھ رہے ہیں



گنگ اپنے ساز کی
ایک ایک جھانجھ ہے
کس طرح بشارتوں کا ہو جنم
جب دہن ہی موسموں کی بانجھ ہے



دُنیا مری آباد ہے جس راحتِ جاں سے
دیتا ہوں دُعائیں اُسے دھڑکن کی زباں سے

ہجرت سے دفنائیں مرا منہ دیکھ رہی ہیں
شیشے کا فریدار ہوں پتھر کی دُکاں سے

ایسا وہ کس جیسا غزل میں نظر آئے
سب ٹھن ہے اس کا مرے اندازِ بیاں سے



تم ہاتھوں کو بیکار کی زحمت سے بچا لو
دشک کا جواب آتا نہیں خالی مکاں سے

رکھے جو ققیل اپنے سمندر کو بچ کر
شکوہ ہے مری پیاس کو اُس پیر مغاں سے



روشن وہ ہرا گوشہ تنہائی تو کر جائے
یادوں میں سسی، انجمن آرائی تو کر جائے

یہ میری ضمانت ہے کہ پائے گا وہ شہرت
تھوڑی سی وہ پہلے مری رسوائی تو کر جائے

کردوں میں اُسے عقل کے مفہوم سے واقف
کچھ دن کے لیے وہ مجھے سودائی تو کر جائے

سب کہتے رہیں میں اُسے قاتل نہ کہوں گا
لیکن وہ کوئی کارِ مسیحائی تو کر جائے

میں دیکھ سکوں چہروں کے پیچھے بھی ہے کیا کچھ
اسی سی عطف وہ مجھے بینائی تو کر جائے

میں کہ تو سکوں مجرم محبت کی وضاحت
پھر جو وہ سزا دے، مری شنوائی تو کر جائے

ہے فرمن ققیل اُس پہ مرا جان چھڑکنا
پر وہ مری کچھ سو سدا افزائی تو کر جائے

محکم دلائل

بکھری پڑی تھیں زمیں پر کچھ آوازیں
میری سماعت نے جن کو سمیٹا
اُن میں اک آواز تھی ایسے کاہن کی
جو تمکنت سے خلا میں تھا لیٹا
میں کون ہوں کیا ہوں؟ پوچھا نہ یہ اُس نے
مجھ کو بس اک رٹ میں اُس نے پیٹا
تجھ میں رواں ہے لہو کس قبیلے کا
تو جس کا بیٹا ہے وہ کس کا بیٹا؟





گئے برس جو گیت سُنا تھا ہر مالے ساون سے
وہی گیت میں سُنا چاہوں آج تری جھانجھن سے

پورے چاند کی رات کو جب تُو میرے پاس نہیں تھی
اگنی بان برستے دیکھے میں نے کرن کرن سے

تیرے حوالے میں نہیں کرتا اس لیے دل اپنا
تجھ کھلونے توڑنے کی عادت سی ہے بچپن سے

یہ سب جادو ہے ایسی تیرے ساٹولے پن کا
آتی ہے چندن کی خوشبو تیرے مست بدن سے

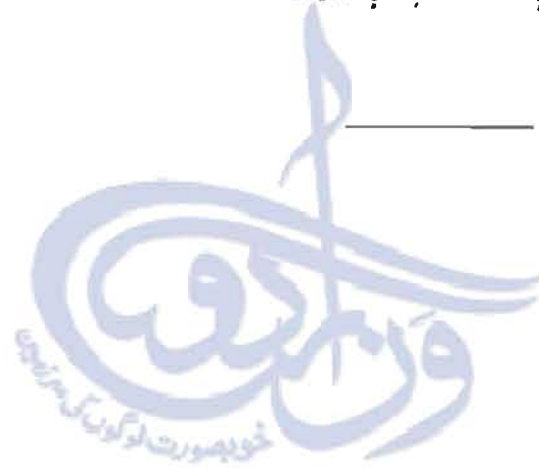
جمہوریت

کہتے ہیں جس کو جذبہ جمہوریت ، وہ پیڑ
تا زندگی کسی سے اکھاڑا نہ جائے گا
جس کی جڑیں عوام کے ذہنوں میں ہوں قہریں
وہ باغ آندھیوں سے اُجاڑا نہ جائے گا

کاہے چُپ چُپ کر بیٹھ تو میری کوتاہی میں
وہ سبھی کیا بھتی، جس کو آئے لاج بھن سے

ایسی بات نہ اب پھڑوں گا جو ایسی دلی ہو
پہلے ہی میں تجھے مناکر لایا لاکھ بھن سے

لاکھ ققیل کسے جاؤ تم اک پتے پریمی ہو
آرمی تو پہچانا جائے اپنے چال چلن سے



Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



آنسو آنسو ہر قطرہ شبِ بنم کا ہے
یہ منظر، یہ گرہ کس موسم کا ہے

پس منظر میں شور ہے کچھ زنجیروں کا
سانے دھوکا پائل کی جھم جھم کا ہے

کچھ گونگوں نے چھیرے گیت اُجالوں کے
اندھوں کی بستی پر سورج چمکا ہے

میں نے دیا الزام تو بیچ اٹھا شیطان
یار، یہ سارا کیا دھسرا آدم کا ہے

باندھے وہ دستار جو سر بھی رکھتا ہو
قول یہ میرے اک بچے ہمدم کا ہے

پتھر جس کو سب کہتے ہیں یار قتیل
پہلا نام وہ ایک حسین صنم کا ہے



جو خود اس کا رستہ روکیں اُن کے آگے ٹھکتی ہے
درد نہ ہر دروازے پر تفتیر بھلا کب رکتی ہے

میری گلی کے ٹٹنے والے شور مچاتے ہیں لیکن
تب امداد پہنچتی ہے جب بربادی ہو چکتی ہے

ساؤن تو ہے ایک مگر کیا کیسے اس دو رنگی کو
باہر پڑے پھوار تو اندر جان ہماری ٹھکتی ہے



شناخت

میں نے اک شعر سنا
 رُوح مری جھوم گئی
 دل میں کھنک پیدا ہوئی
 سوچ نے اگڑائی لی

میں نے اس شعر کے خالق سے کہا:
 اپنی تخلیق مرے سایہ تحسین ہنر تک لے آ
 تاکہ میں بھی تری اس پرورش لوح و قلم کے انداز
 غور سے دیکھ سکوں

کبھی نہ دیکھی کسی نے اب تک نرمی بانجھ درختوں میں
 جس ڈالی پر پھل آجائے صرف وہ ڈالی جھکتی ہے

ایک ہی وہ بازار تھا جس میں یوسف بیچا گیا قنصل
 اپنے ہر بازار میں اب انسان کی قیمت چھکتی ہے

دیکھ کے اُوروں سے کموں
 آج میں نے بھی وہ آواز سُنی ہے جس میں
 اک چپکتے ہوئے غنچے کی ادا شامل ہے
 اک چپکتے ہوئے پنچے کی صدا شامل ہے
 اک اُڈتے ہوئے بادل کی دُعا شامل ہے
 — اور اس شعر کے خالق نے کہا: —

اے ہرے قدر شناس

ساری دُنیا سے الگ یہ تری تحسین ہنر!

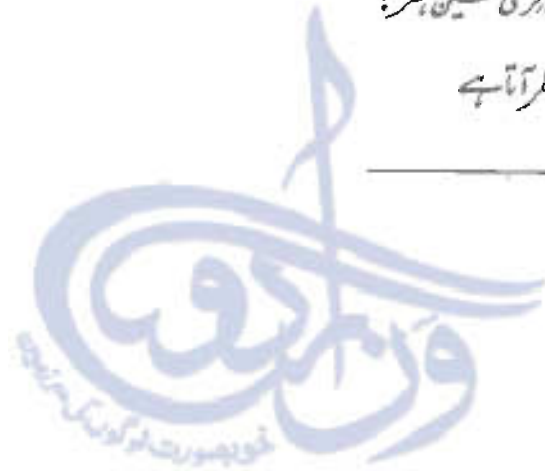
تُو کوئی صاحبِ اولاد نظر آتا ہے



سراپا غم ہیں اور وہ گدگدانا چاہتا ہے
 زبردستی کوئی ہم کو ہٹانا چاہتا ہے

وہ رہبر، بھائی ہے جو ایک بھری جانور کا
 ہماری لاکش پر آنسو بہانا چاہتا ہے

کیا ہے جس نے پتھر اوٹھنا کا نام لے کر
 وہ دُنیا میں کوئی نیکی کمانا چاہتا ہے



بہت زوروں پہ ہے دونوں طرف شوقِ شہادت
بے دیکھو وہی جنت میں جانا چاہتا ہے

کہو سب شہر والوں سے کہ اُس کے ساتھ ہو لیں
قتیلِ انسانیت کا گیت گانا چاہتا ہے



وہ کھل کر اب کوئی جلوہ دکھانا چاہتا ہے
وہ کہتا ہے ”اُسے سارا زمانہ چاہتا ہے“

خدا شاہد، بُری نیت نہیں رکھتا وہ قاتل
تماشاِ قصِ پِیمل کا دکھانا چاہتا ہے

وہ زخمِ آئیں گے جن کے ساتھ اک مرہم بھی ہوگا
نئے تیروں سے وہ ترکش سبانا چاہتا ہے



یہ کہہ کر ایک نیا پنجرہ بنا دیتا ہے صیاد
پرنده خود ، قفس کا آب و دانہ چاہتا ہے

قتیل اُس کو ہماری بے گناہی سے غرض کیا
سزا دینے کا وہ کوئی بہانہ چاہتا ہے

ایفروایشیائی نغمہ

زنجیری جب ٹوٹیں گی جھنکار تو ہوگی
صدیوں کی سوئی دنیا بیدار تو ہوگی

پھیلے ہوئے اس دھرتی پر ہیں لوگ جہاں تک
پہنچے گی زنجیروں کی جھنکار وہاں تک
دنیا جاگی تو کوئی محکوم نہ ہوگا
کوئی وطن آزادی سے محروم نہ ہوگا
چکنا چور عسلا می کی دیوار تو ہوگی
صدیوں کی سوئی دنیا بیدار تو ہوگی



دُنیسا بھر کے انسانوں کا یہی ہے کسٹ
 سب کا حق ہے امن اور چین سے زندہ رہنا
 پاس نہ آنے دو نفرت کے طرفانوں کو
 پیار کی آج ضرورت ہے سب انسانوں کو
 پیار کی مٹی سے پیدا مہکار تو ہوگی
 صدیوں کی سوئی دُنیسا بیدار تو ہوگی

امن کے بادل اک دن ہر شے چھائیں گے
 دھوپ کے بدلے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے ملیں گے
 پورب پچھم ہوگی آزادی کی رسم جھم
 روکے گی جو قوم اسے کھلانے کی مجرم
 پت بھڑ میں بھی یہ دھرتی گلزار تو ہوگی
 صدیوں کی سوئی دُنیسا بیدار تو ہوگی



بیتے میں حسرتوں کی جلن چاہتا نہیں
 غم اب کوئی نیا مرا من چاہتا نہیں

وہ میرے شہر دل میں اگر آبا تو کب
 وہ کون ہے جو اپنا وطن چاہتا نہیں

اتنا تھا وہ غموں نے فرشتہ بنا دیا
 اب وہ تعلقات بدن چاہتا نہیں

کہتے ہیں اُس کے حال پہ روتے ہیں دیوتا
 جس سانپوری کو اُس کا سجن چاہتا نہیں

ہونا ہو جس کو دفن خود اپنے ہی صبر میں
وہ چہرہ آنسوؤں کا کفن چاہت نہیں

اُس کو نہ پا کے جو اُسے رُسا کریں قسیر
میں ایسے ظالموں کا چلن چاہت نہیں



یارو، کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بددیں کر اُسے بھول جاؤں میں

دل تو جلا گیا ہے وہ شہرِ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں

مُنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں سر نہ جاؤں میں

اک شب بھی وصل کی نہ ہر ساتھ دے سکی
عمرِ فراق آ کر تجھے آ زماؤں میں

غبارِ بٹیمھ گیا

اپنے ماضی کے ناراض لمحات سے
 یہ مری آج کی گفتگو —
 دل پر رکھی ہوئی اک گراں بارسل توڑ کر
 اور بھی کچھ مجھے منفعل کر گئی
 وہ جو کچھ روح میں ہلکے ہلکے سے گرداب تھے
 اُن کو بھی وہ برے غم کے مالا ب میں منتقل کر گئی

بدنام میرے قاتل سے تنہا تو ہی نہ ہو
 لا اپنی ٹہر بھی سرِ محض لگاؤں میں

اُترا ہے بام سے کوئی اسم کی طرح
 جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں

اُس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
 ہنس کر اُسے قتل گئے سے لگاؤں میں

اور پھر اتنے اُن دیکھے آنسو بہائے مری آنکھ سے
 تر بہ تر دامن جانِ دہلی کر گئی
 لیکن اتنا ہوا
 شدتِ درد کو
 آج کی گفتگو معتدل کر گئی —



محبت ہو رہی ہے تازہ دم آہستہ آہستہ
 بڑھائیں آپ بھی آگے قدم آہستہ آہستہ

تھکے پاؤں بھی ہم تیرے شبستاں کے مسافر ہیں
 پہنچ ہی جائیں گے منزل پر ہم آہستہ آہستہ

ترا بس تو کیا، پیغام ہی نے کر دیا ثابت
 خوشی آئے تو مٹ جاتے ہیں غم آہستہ آہستہ

خود اُن کو ہم نے اپنے کعبہ دل میں بسایا تھا
 اب اس کعبے سے نکلیں گے صنم آہستہ آہستہ



ابھی تو وہ ہمارے شہرِ دل کے خاص مہمان ہیں
کھلے گاہِ خُسن والوں کا مہبمِ آہستہ آہستہ

بہت کم آس رکھنی چاہیے شادابیِ دل کی
برستا ہے یہاں ابرِ کرمِ آہستہ آہستہ

قتیلِ انجمن ہوتا کاش اپنا عاشقوں جیسا
کر دم دیتے کسی زانو پہ ہم آہستہ آہستہ



ہواؤں کی زبانی سُن لیا ہو گا ستاروں نے
سندلیہ جو تجھے بھیجا ترے فرقت کے ماروں نے

وہ آنکھیں جو وضاحت کے سبھی انداز کھتی تھیں
یہ کیا ابہام پیدا کر دیا ان کے اشاروں نے

کماؤں کے تجربے نے دیکھ یہ ہوتی ہے مجبوری
گلے سے پتھروں کو جب لگایا آفتابوں نے

پہننے کو دیا آخر لبِ اوہ خشک پتوں کا
خزاں کو ایک سوتیلی بہن سمجھا بہاروں نے

نظر آیا ہر اک تصویر میں وہ آشنا چہرہ
رُلا ڈالا مصوّر ہم کو تیرے شاہکاروں نے

خُدا جس کی زباں سے بولتا تھا، وہ چڑھا سولی
یہ نظارہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہزاروں نے

وہ دیتا ہے قلیل اور بے غشامد مجھ کو دیتا ہے
خُدا میرا نہیں دیکھا ترے پروردگاروں نے



وفا کا بوجھ ہے سر پر، مگر اُس کا یہ کہنا ہے
کہ یہ پتھر گھیل جانے تک اُس کو زندہ رہنا ہے

وہ پر بت کا اک ایسا پڑ ہے جس نے زمیں میں
بدن کے ڈھانپنے کو برف کا ملبوس پہنا ہے

وہ اک سایا جو تحفے میں دیا تھا اُس کو خوابوں نے
وہی اب اُس کا آئینل ہے وہی اب اُس کا گناہ ہے

لکھا تھا ریت پر اک دوسرے کا نام کیوں ہم نے
نیچے میں جو صدمہ ہے وہ ہم دونوں کو مہنا ہے

رہیں گے سب یہاں جھوٹی خوشی پہنے ہوئے، ورنہ
قرب آکر جسے دیکھو وہ اندر سے برہنہ ہے

قتیل ایسی بھی اک عورت ہے اس رشتوں کی بہن
کہ جو ماں ہے نہ بیٹی ہے نہ بیوی ہے نہ بہنا ہے

کوکھ چلی

(عامسی دہنوی مرحوم کی مختصر پنجابی نظم کا پہلا ڈ)

گاؤں سے باہر،
ٹیلے والی، اک درویش کی قبر کے اوپر
آدھی رات کو
بھلے کپڑے، جگمگ زلیور پہنے ہوئے
وہ کون تھی دیا بھلانے والی
سب کچھ ہوتے جانے وہ کیا مانگ رہی تھی
زنگ رہی تھی کیوں اچلا دوشالا اپنا کیسر میں
بمٹو بٹر کیوں چاند کی جانب دیکھ رہی تھی

تکیہ اپنی چھاتی پر وہ کیوں رکھتی تھی
 انگ وہ پٹوں کی اک سیج بچھاتی کیوں تھی
 سیج پر لیٹی کُمنی کے بل
 اپنے آپ سے کیوں وہ باتیں کرتی تھی
 اور پھر باتوں باتوں میں
 وہ برہم کیوں ہو جاتی تھی
 سب کچھ ہوتے چاہتی کیا تھی
 جھلبلیں کپڑوں، جگمگ زلیوروں والی
 اک درویش کی قبر کے اُوپر
 دئیے جلانے جاتی کیوں تھی؟

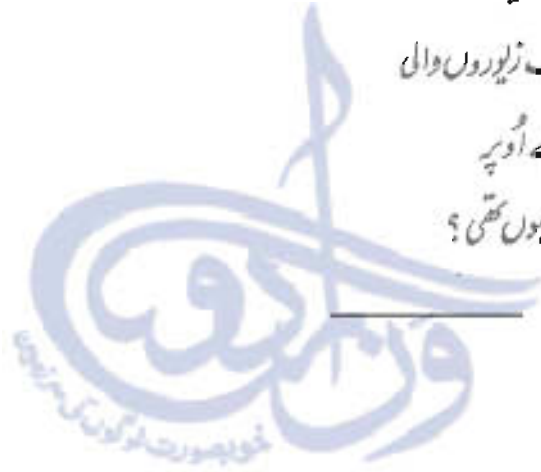


جیسا اس کے لیے سُنا تھا ویسا ہے
 میں نے برسوں بعد اُسے اب دیکھا ہے

ہر منظر کا ہوتا ہے اک پس منظر
 وہ لاکھوں میں ایک ہے لیکن تنہا ہے

میں دریا بن جاؤں بھی تو کیا حاصل
 وہ ہے سمندر اور صدیوں کا پیاسا ہے

گیا تھا جب وہ اُس دن آگ بگولا تھا
 واپس آیا ہے تو برف کا پُتلا ہے



پھر ماضی کو چوما اس کے ہنٹوں نے
پھر اک لفظ مرے کانوں میں رويا ہے

میلہ لگا ہے چار طرے سناٹوں کا
کہیں کہیں کوئی سایا بسکی لیتا ہے

کانچ کا ہر جذبہ پیچھے ہم چھوڑ آئے
اب تو اپنا بچی عمر کا رشتہ ہے

مجھ کو اپنے حال پر آئے رحمِ قہر
میں نے اک بچی کو اڑتے دیکھا ہے



گڑا ہے بیگانہ بن کر کیسا وہ
کبھی نہیں تھا آج سے پہلے ایسا وہ

اندر اندر ٹوٹا سا اک پیمانہ
باہر باہر لال گلابی نئے سا وہ

میں نے جھانکے دیکھا اس کی آنکھوں میں
دو لگتا ہے جیسا نہیں تھا ویسا وہ

چوٹ لگی ہے شاید اُس کے بھی دل پر
آج دکھائی دیتا ہے مجھ جیسا وہ

میرا اور اصول ہے اُس کا اور قتل
پیار ہی پیار ہوں میں پیسہ ہی پیسہ وہ



لے گیا اپنی سب رکھائیں اپنے ساتھ
دروازے پر دستک دینے والا ہاتھ

آپ سنبھل جائے گا ٹھوکر کھانے پر
دل کو میں سمجھاؤں میری کیا اوقات

یاد نہ وہ آئے تو آنکھیں کیا برسیں
جب چھائے گا بادل تب ہوگی برسات

صرف لکھے تھے جتنے وہ سب پھیل گئے
کاغذ کے دشمن ہوتے ہیں گیلے ہاتھ

مستقبل تو مستقبل ہی رہتا ہے
یوں لگتا ہے کبھی نہ بدلیں گے حالات

تھا مجھ پر بھی تنگ مرا گھر اس پر بھی
تنہائی نے رہن چاہا میرے ساتھ

میں نے تو دو چار الزام خریدے تھے
دل کے شہر سے تم کیا لائے ہو سوغات

ساری رات مسلسل جاگتے والے نے
آنکھوں میں کچھ خواب سجائے پھلی رات

یہ قصہ اپنی تاریخ کا حصہ ہے
کھا گئے ہاتھی چند ابا بیلوں سے مات

بانگے سے گریے قسیر محبت بھی
ایک طرح سے ہوتی ہے وہ بھی خیرات

سلسلہ خیالوں کا

جن کے تینکے تک مجھ کو پہچانتے ہیں
یاد مجھے وہ تیری گلیاں آج بھی ہیں
جن کو حاصل رہا سدا رتجگا کوئی
میرے ذہن میں وہ رنگ ریاں آج بھی ہیں
آج بھی میں سوچوں تو ایسا لگتا ہے
ہونٹ ترے مصری کی ڈلیاں آج بھی ہیں

جب میں پیتے وقت کی باتیں کرتا ہوں
کچھ مر جھائے پھول ممکنے لگتے ہیں
کہوں ترے پس منظر میں جب کوئی غزل
بہت پُرانے حب م کھنکنے لگتے ہیں
اب بھی گنتا ہوں جب نام رقیبوں کے
لوگ مجھے حیرت سے تکتے لگتے ہیں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بھڑکاتی ہے جس کو یاد جوانی کی
دیر تلک وہ شعبہ سرد نہیں ہوتا
موسم کیسا بھی ہو خون چمکتا ہے
عمر کوئی ہو چہرہ زرد نہیں ہوتا
یاد نہ رکھے جو امتداد و فائز کے
وہ سب کچھ ہوتا ہے مرد نہیں ہوتا

عمر کے جس رستے پر میں نے پاؤں بھرے
میرے جسم کے ساتھ چلا ہے جسم ترا
پکڑے رہا میں وقت کی انگلی جہاں تلک
پل پل مجھ پر بھایا رہا طلسم ترا
رستہ روکیں جب حالات کے اندھیار
روشنیاں دیتا ہے مجھ کو اسم ترا

چومتا ہوں میں اُن پیروں کو سینوں میں
جن پیروں میں روشنیوں کی مجا نہیں ہے
رات کو اکثر آنکھیں ڈھانپ کے سوتا ہوں
جلگ جلگ یوں بھی میرا قہر ہے
کیا لینا مجھ کو ان چاند ستاروں سے
میرے اندر تو اک سورج روشن ہے

لوٹے گی دیوار

کچھ روز سے زنداں نظر آتی ہے یہ دُنا
اب کچھ تو یہاں اہل نظر ہو کے رہے گا
انسان سمٹا ہی چلا جائے کہاں تک
لگتا ہے کہ دیوار میں در ہو کے رہے گا



Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



راک بار جو تک لے اُسے تکتا ہی چلا جائے
شعلہ سا بدن اُس کا دکھتا ہی چلا جائے

کردار ادا جب میں کروں یا دِ صبا کا
وہ پھول ک مانند نہکتا ہی چلا جائے

حالات کی بجلی نے کیب را کھ نشیمن
پر آکس کا پنچھی کر چکتا ہی چلا جائے

آجائیں میسر جسے آنکھوں کے وہ ساغر
وہ رند تو پی پی کے بکتا ہی چلا جائے

پھولوں کی توقع ہے نہ امکان ثمر کا
اک پیڑ مگر پھر بھی لکتا ہی چلا جائے

ہم لاکھ مہذب ہوں مگر تم ہی ستاؤ
جب ضبط کا پیمانہ پھٹتا ہی چلا جائے

ہر گام پہ الزام قلیل اب بھی ہیں لیکن
اُن پاؤں میں بچھو جو چھٹکتا ہی چلا جائے



بے ذوق تھی یا حُسن سے آگاہ تھی پہلے
کیسی تری دُنیا برے اللہ تھی پہلے

میں نے تو سنا ہے کہ یہ دُنیا تری یا رب!
شاعر کے خیالوں کی گزر گاہ تھی پہلے

کرنے کو ہے انسان خلاؤں کو بھی آباد
جو آج حقیقت ہے وہ افواہ تھی پہلے

اب واعظ و ناصح جہاں کرتے ہیں عبادت
کہتے ہیں وہ اک رند کی درگاہ تھی پہلے

پھینا ہے مرا جام اُن آنکھوں نے ، وگرنہ
اس چیز سے بچنے کی کہاں راہ تھی پہلے

تھا رشک رقیبوں کو برے حسن نظر پر
اک حُسن کی دیوی برے ہمراہ تھی پہلے

نزدیک سے دیکھا ہے قاتل اب کے گھر اپنا
جنت کی برے دل میں بہت چاہ تھی پہلے



صحراؤں میں اک چھاؤں سی بکھراتی رہے گی
رُت کوئی بھی ہو، زُلف وہ لہراتی رہے گی

تم چھین تو لو گے برے سادن کی گھٹائیں
آواز پیسے کی مگر آتی رہے گی

جاتا رہا خوابوں میں خلل ڈالنے والا
اب دن میں بھی اکثر تمہیں نیند آتی رہے گی

بغضتے گی نہ اس کو کوئی سُورج کی عدالت
یہ رات ستاروں کی قسم کھاتی رہے گی

کچھ ضبط نہ کر پائیں گے عشاق بھی تیرے
کچھ صورتِ حالات بھی جذباتی رہے گی

صحر اکو نہ پھوڑے گا کبھی شہر کی خاطر
دُنیا ترے دیوانے کو سمجھاتی رہے گی

تجھ پر بھی قتلِ آن پڑی جب کوئی اُفتاد
سب زندہ دلی یار تری جاتی رہے گی

ڈرو اُس وقت سے

ڈرو اُس وقت سے

اے شاعر، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو

اچانک جب تمھاری سمت

کچھ صدیوں پرانے شیش محلوں سے

سُنا سن ریر برسیں گے

بہت چلاؤ گے تم

اور پکارو گے بہت باذوق دُنیا کو
مگر باذوق دُنیا کا ہر اک باشندہ
پہلے ہی سے گھائل ہو چکا ہوگا
جو باقی لوگ ہوں گے

وہ تمہارا ساتھ کب دیں گے

کہ وہ تو رجعتوں کی ہیر دُٹن پینے کے عادی ہو چکے ہوں گے
انہیں تو صرف وہ باتیں بھلی معلوم ہوں گی
بہالت کا اندھیرا اور بھی ان کی رگوں میں جن سے بھر جائے
وہ باتیں —

عقل و استدلال کا اک شاہِ بحر میں نہیں ہوتا
یہ مانا تم بہت سمجھاؤ گے اُن کو
مگر کوئی نہ سمجھے گا

اور اس دورِ سیاہی میں
جو برپا کر بلا ہوگی

وہاں کوئی بھی حُر پیدا نہیں ہوگا تمہاری پاسداری کو
میں گے سب تمہارے خون کے پیاسے

ڈرو اُس وقت سے
اے شاعر، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو،
جو ممکن ہو تو بڑھ کر روک لو
اُس آنے والے وقت کا رستہ



اپنے لبوں کو دشمنِ اظہارِ مت بنا
پتے ہیں جو اُنہی کو گنہگارِ مت بنا

دل کو دبا دبا کے نہ رکھ دھڑکنوں تلے
بے چینوں کے لطف کو آزارِ مت بنا

جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گلاب ہیں
لبھ کے فرق سے اُنھیں تلوارِ مت بنا

ترکِ دمن کا جرم نہ مانے گا تُو نہ میں
اس مسئلے کو باعثِ تکرارِ مت بنا

مہراجِ نظر

یاد آئے خالقِ حُسن و جمال
کوئی چہرہ خوبصورت دیکھ کر
زندگی سونا دکھائی دے نہیں
صرف اک مٹی کی مورت دیکھ کر



روکا ہے تُو نے جس کو سدا عرضِ حال سے
ہجرت وہ کر گیا ترے شہر وصال سے

وہ مر گیا جب اس کی سکونت بدل گئی
بیون سے بڑھ کے پیار تھا پنچھی کو ڈال سے

بندھوا رہا تھا جو مرے پاؤں میں بجلیاں
آگے بڑھانہ خود وہ حدِ اعتدال سے

تمہی ایسی بے خودی کہ جب آیا وہ سامنے
مفہومِ گر گیا مرے دستِ سوال سے

الزام کچھ تو گردشِ ایام کو بھی دے
اپنے ہر ایک غم کو غمِ یارِ مست بنا

آ میرے بازوؤں میں کہ ساحل پر جا لگیں
اس موجِ موجِ دقت کو منہ دارِ مست بنا

تیرا یہ ضبط ، اور وہ شعلہ سا آدمی
سورج کے آگے موسم کی دیوارِ مست بنا

شاید وہ تیرے مُنہ پہ ہی سچ بولنے لگے
چہرے کو آئینے کا پرستارِ مست بنا

ہر ایک کے لیے نہ کھلا رکھا اسے قتل
یہ دل ہے ایک گھر اسے بازارِ مست بنا

تھامیں بھی حکمران کبھی اقلیمِ حسن پر
کچھ لے سبقِ رقیب مرے ہی زوال سے

برسوں چلے قلیلِ زمانے کے ساتھ ہم
واقعہ ہوئے نہ پھر بھی زمانے کی چال سے

گر یہ مسرت

احباب سے چھپ چھپ کے بھی رویا ہوں میں اکثر
پر آج بھری بزم میں
رونے کا مزا اور ہی کچھ ہے

احباب کو حیرت، کہ مرے قہقہہ بردار لبوں پر
کیوں لے گئیں سبقت مری بھیگی ہوئی پلکیں —
مرے تپتے ہوئے آنسو

شاید مرے احباب کو معلوم نہیں ہے
اظہارِ مسرت کبھی ہوتا ہے جو رو کر
سوار کا ہنسا بھی اُسے چھو نہیں سکتا

آنسو ہیں وہ موتی

پلوں کے صدف سے جو نکتے ہیں اُسی دم

جب دل کے سمندر میں

خوشی کا کوئی طوفان بپا ہو

طوفان سما سکتا نہیں صدف ہنسی میں

آنسو ہی اُسے اپنی تراوٹ میں سیٹھیں تو سیٹھیں

آنسو کہ جسامت میں ہیں قطرے سے بھی کچھ کم

اظہارِ مسرت میں سمندر سے بڑے ہیں



آخر وہ میرے قد کی بھی حد سے گزر گیا

کل شام میں تو اپنے ہی سائے سے ڈر گیا

مٹھی میں بند کیا ہوا بچوں کے کھیل میں

جگنو کے ساتھ اُس کا اُجلا بھی مر گیا

کچھ ہی برس کے بعد تو اُس سے ملا تھا میں

دیکھا جو میرا عکس تو آئینہ ڈر گیا

بلے جس مرے احباب ہیں

کاش اُن کو بتائے کوئی ہمد

حاصل جو خوشی آج ہوئی ہے مرے دل کو

شاید وہ تبسم میں سیٹی ہی نہ جاتی

ہزنوں پہ تبسم بھی بہت خوب ہے لیکن

آنکھوں میں ترشح کی فضا اور ہی کچھ ہے

برسات میں رم بھم کی صدا اور ہی کچھ ہے

اس بزم میں رونے کا مزا اور ہی کچھ ہے

ایسا نہیں کہ غم نے بڑھالی ہو اپنی عمر
موسم خوشی کا وقت سے پہلے گزر گیا

لکھنا مرے مزار کے کتبے پہ یہ حروف
مرحوم زندگی کی حراست میں مر گیا



کچھ راحتوں کی کھوج میں آئی تھی زندگی
دیکھا تو راک لحد میں سمائی تھی زندگی

کیا کیا نہ ایک شخص نے رکھی سنبھال کر
معلوم اب ہوا کہ پرانی تھی زندگی

ہو جائے ریزہ ریزہ لگے جب ذرا سی ٹھیس
کیا سوچ کر خدا نے بنائی تھی زندگی

تھا دشمنوں کے واسطے عبرت کا یہ مقام
کاندھے پہ دوستوں نے اٹھائی تھی زندگی

اقراء

پیمبر سے کہا جبریل نے:

اقراء

پیمبر نے کہا:

میں پڑھ نہیں سکتا

مگر اُس لمحہ نور و تجلی کا نتیجہ تھا

کہ ایک اُمتی وہ عالم بن گیا

دوڑے زمیں پر جن سے بڑھ کر

کوئی بھی علم و بصیرت کا نہ مالک تھا۔

یہیں تک ختم ہو جاتا نہیں یہ سلسلہ علم و بصیرت کا

پیمبر کے غلاموں تک نے پائی روشنی

علم و بصیرت کی

اُجالا ہو گیا مشرق سے مغرب تک

واپس گئی عدم کی طرف خاک اور ڈھک
سانسیں پہن کے دہریں آئی تھی زندگی

اُڑتا ہوا وہ ایک پرندہ ہے اب کہاں
اپنے پردوں پہ جس نے سبائی تھی زندگی

دیکھا تھا رخسارِ ہستی میں جب تقیل
داؤ پہ ہر بشر نے لگاؤ تھی زندگی

(ڈاکٹر یوسف کی رحلت پر)

کما میرے زمانے سے گزرتے وقت نے

اقراء

کما میرے زمانے نے

مجھے پڑھنا تو آتا ہے

مگر میں بھول جانا چاہتا ہوں سارے لفظوں کو

اور ان لفظوں میں پوشیدہ ہر اکِ علم و بصیرت کو

کتا میں غرق دریا کر کے اطمینان و راحت چاہتا ہوں میں

کہ اب ایسا ہی کرنا چاہیے مجھ کو

گزرتے وقت نے پوچھا بھلا کیوں؟

کما — علم و بصیرت اور کتب خانے برے کس کام کے

جب ہر چر اس ہے پر

بلند آواز لاؤ د اسپیکروں سے وہ بھی کچھ نشر ہوتا ہے

نفی ہوتی چلی جاتی ہے جس سے دم بدم علم و بصیرت کی

— پھر اس کے ساتھ، سچی بات تو یہ ہے

نہ میں کوئی پیسہ ہوں، نہ تو کوئی فرشتہ ہے

میں تیری بات کیوں مانوں — ؟



ہوا کی لہر کوئی چھو کے میرے یاد سے آئی
کوئی تازہ خبر یوں بھی سمندر پار سے آئی

ہوں سے کم اور آنکھوں سے بہت کرتا ہے وہ باتیں
بلاغت اس میں یہ پابندی اظہار سے آئی

وہ اس کی گفتگو، کلیاں چلنے کی صدا جیسے
یہ نرمی اس کے لہجے میں ہمارے پیار سے آئی

کشت رکھتا نہیں اب بھول میرے اسطے کوئی
کہ مجھ تک ہر ملک اس زلفِ خوشبودار سے آئی

یہاں ہے جو بھی یوسف، خود زلیخاؤں کا گاہک ہے
روایت یہ نئی کیا جانے کس بازار سے آئی

وہ اک مغرور سی لڑکی، خوشی جس کا تخلص ہے
مرے پاس آگئی لسیکن بڑے اصرار سے آئی

اندھیروں نے قلیل اکثر اُسی دیوار سے جھانکا
اُتر کر دھوپ میرے گھر میں جس دیوار سے آئی



Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



وہ ساون جس میں زلفوں کی گھٹا چھائی نہیں ہوتی
جو برسے بھی تو سیراب اپنی تنہائی نہیں ہوتی

جنابِ عشق کرتے ہیں کرم کچھ خاص لوگوں پر
ہر انسان کے مقدر میں تو رسوائی نہیں ہوتی

سمندر پرسکوں ہے اس لیے گہرا بھی ہے ڈرنہ
چلتی ندیوں میں کوئی گسائی نہیں ہوتی

یہ واعظ ہے، نہیں تقریر میں رکھتا جواب اپنا
مگر اس شخص کی باتوں میں سچائی نہیں ہوتی

جہاں ساقی کے ایسا پر کوئی کم ظرف آ بیٹھے
وہاں خوش ذوق بندوں کی پذیرائی نہیں ہوتی

کبھی چہرے بدل کر بھی یہاں کچھ لوگ آتے ہیں
کبھی کچھ دیکھتی آنکھوں میں بینائی نہیں ہوتی

قتیل اکثر یہ دیکھا ہے کسی مفلس کے آنگن میں
برات آئے تو اس کے ساتھ شنائی نہیں ہوتی

قتیل اُس شخص کا کیا واسطہ میرے قبیلے سے!
دفا کے جرم میں جس نے سزا پائی نہیں ہوتی

معجزہ

بشر کے روپ میں اک دلربا ظلم بنے
شفق میں دھوپ، طائیں تو اُس کا جسم بنے
وہ معجزات کی حد تک پہنچ گیا ہے قتیل
حروف کوئی بھی لکھوں اُسی کا اسم بنے



دل لگا بیٹھا ہوں لاہور کے ہنگاموں سے
پیاد ہے پھر بھی ہری پور، تری شاموں سے

کبھی آندھی، کبھی شعلہ، کبھی نغمہ، کبھی رنگ
اپنا ماضی مجھے یاد آئے کئی ناموں سے

ایک وہ دن کہ بناں دید تڑپ جاتے تھے
ایک یہ دن کہ بھل جاتے ہیں پیغاموں سے

جب مرے ہاتھ پہ کانٹوں نے دیا تھا بوسہ
وہ برا پہلا تعارف تھا گل انداموں سے

کشش جمال

قدم قدم پہ کئی غوش جمال میں لیکن
کسی میں بات کہاں میرے مرجیں جیسی
نگاہ جو بھی اٹھے اس کے خال و قد پہ گئے
کشش ضرور کوئی اکس میں ہے نرئی جیسی

جان و دل دے کے محبت کے خریدار بنے
یہ کھری چیز تو ہلتی ہے کھرے داموں سے

پور بازار میں پکے نہ پہنچ جائے کہیں
جنس ایماں کو بنگلوائے گوداموں سے

پیروی حضرت غالب کی ہوئی نصف قلیل
مے تو ہلتی نہیں رنجست ہے فقط آموں سے



جب کسی جام کو ہونٹوں سے لگایا میں نے
رقص کرتا ہوا دیکھا ترا سایا میں نے

مجھ سے مت پوچھ مرے محتسب شہر سے پوچھ
کیوں تری آنکھ کو پیسا نہ بنایا میں نے

لوگ کہتے ہیں قصیدہ وہ ترے حُسن کا تھا
عام سا گیت جو محفل میں سُنایا میں نے



میکدہ بند تھا لیکن جوٹھی گر جا بادل
اپنی توبہ کو چٹخت ہوا پایا میں نے

شعر و نغمات کا رشتہ کبھی ٹوٹا نہ قسّیل
جب غزل بن کے وہ آیا اُسے گایا میں نے



جب سے آیا ہے ترے پیار کا موسم جاناں
دل میں رہتی ہے لگاتار چھپا چھم جاناں

زخم جو تم نے دیے اُن کا سندیسہ یہ ہے
بھینا اب نہ حسد را کوئی مرہم جاناں

جل رہے تھے مری پلکوں پہ جو یادوں کے چراغ
اب تو اُن کی بھی لویں ہو گئیں مدھم جاناں

ٹرک گئی سانس بچھڑنے کی گھڑی جب آئی
دل مگر پھر بھی دھڑکتا رہا پیہم جاناں



اب اور تب

کہا اُس نے —

مجھے تب واقعی تم سے محبت تھی

کہا میں نے —

مجھے تو آج بھی تم سے محبت ہے

وہ تب کی بات کرتی ہے

میں اب کی بات کرتا ہوں

مگر جو فاصلہ تب اور اب کے درمیاں حائل ہے

وہ ہم سے تو بڑھ کر بھی سیٹھا جا نہیں سکتا

وہ اب تک آ نہیں سکتی

میں تب کو پا نہیں سکتا

باندھ لوں میں بھی تری یاد کے گھنگھرو، لیکن
رقص کرنا بھی تڑپنے سے نہیں کم جاناں

تُو نے چھوڑا نہ کسی ردِ عمل کے قابل
اب ہر اشعر، نہ شعلہ ہے نہ شبنم جاناں

جانے کیا تجھ سے ہوئی بات کہ گم صُغم ہے قاتل
اب ترا نام بھی لیتا ہے وہ کم کم جاناں





دستِ عوام ہو کہ گریبانِ شہر یار
اس دُورِ ناسپاس میں دونوں ہیں بے وقار

وہ شور ہے کہ گیت اُبھرتا نہیں کوئی
یوں سدا بچ رہے ہیں کہ گھائل ہے تار تار

آئی نظر اُنق پہ شفق سی کھلی ہوئی
دیکھا تو پڑ رہی تھی وہاں غون کی پھوار

کانٹوں سے کیا شکایت بیگانگی کریں
پھولوں نے خود ہی کھول دیا رازِ نو بہار

خود فریبی

ہے بیکار کی بحث یہ جھوٹے پتے کی
جیسے بھی ہو اپنی لاج بچا لینا
تیرے در پر دے نہ بہار اگر دستک
گلے میں کاغذ کے پھول سب لینا

اب دُور تک نہیں کسی آہٹ کی نغمگی
مایوس ہو چلی ہے ہری شام انتظار

سر پر جو آ پڑی ہے تو ہنس کر نبھائیے
حالات پر نہیں ہے کسی کا بھی اختیار

کھائے ہیں وہ فریبِ محبت کے نام پر
اب اپنے آپ پر بھی نہیں ہم کو اعتبار

تُو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خموش
اے دوست میں بھی تیری طرح ہوں گناہگار

شاید کچھ اور بھی میں ترا ساتھ دے سکوں
اے زندگی کبھی تو پیٹ کر مجھے پکار

کوئی کسی کی بات سمجھتا نہیں قندیل
مجھ کو اسی لیے تو ہے دیوانگی سے پیار



جب سے لبوں پہ شورِ گلوں ناچنے لگا
شروں میں ایک عالم ہو ناچنے لگا

جذبات کی برات کچھ اس شان سے چلی
سرکوں پہ تیرا میرا لہو ناچنے لگا

کتنے مزے کی چیز ہے بہت ہوا لہو
اس نے سے بھر گیا تو سبُ ناچنے لگا

میں ناچتا ہوں صرن تڑپنے کے شوق میں
اے دوست کس خیال سے تُو ناچنے لگا

دھوکا ہوا جو رقص پہ کارِ ثواب کا
شیخِ حرم بھی کر کے دھوننا چنے لگا

میں ذبح ہو گیا جو قتل اپنے ہاتھ سے
غوش ہو کے اس خبر سے عدونا چنے لگا

شہر آشوب

رشتہ دیوار و در، تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
مت بگاڑ اس کو یہ گھر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

تیرے میرے دم سے ہی قائم ہیں اس کی دلیں
میرے بھائی یہ نگر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگِ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

شاخ شاخ اس کی ہمیشہ بازوئے شفقت بنی
سایا سایا یہ شعبہ تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے



ہر نئے سورج کی رہ کر پذیرائی کریں
ہم سمجھتے بوجھتے نقصان بینائی کریں

اس جگہ تفتدیر لے آئی ترے بیمار کو
جس جگہ حبلا د بھی شغل میجائی کریں

نام تیرا ہم نے خود لکھا ہے جب ہر اینٹ پر
کس طرح مسمار ہم دیوارِ تنہائی کریں

پاس میرے آگئے ہو جب تو پھر جلدی ہے کیا؟
اُدکھ سپنے بنیں کچھ محفل آرائی کریں

کھا گئی کل ناگماں جن کو فسادوں کی صلیب
اُن میں اک نورِ نظر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

اپنی حالت پر نہیں تنہا کوئی بھی سوگوار
دامنِ دل تر بہ تر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کچھ تو ہم اپنے ضمیروں سے بھی کر لیں مشورہ
گرچہ رہبرِ معتبر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

غم تو یہ ہے گر گئی دستارِ عزت بھی قلیل
ورنہ ان کا نہ ہوں پہ سر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

گر معادونِ عشق میں خلقِ خدا بھی ہے مگر
کیوں نہ ہم کچھ آپ بھی سامانِ رسوائی کریں

پھول جن لوگوں میں بانٹے ان کو لازم ہے قتل
پتھروں سے وہ ہماری عزت افزائی کریں



کون کس کے ہاتھ آیا اور کھلونا ہو گیا؟
پھوڑیے اس بات کو جو بھی تھا ہونا ہو گیا

اُس کے کُوپے کی زمیں جس دن سے میں نے اڑھلی
آسمان اُس روز سے میرا بکھونا ہو گیا

دیکھ لوں تو دیر تک لیتی ہے چٹخارے نظر
ذائقہ اب اس کے چہرے کا سلونا ہو گیا



شام کے سورج نے جب ترچی شامیں ڈال دیں
اپنے سائے کے مقابل میں تو ہونا ہو گیا

میری قیمت ہرن بیتل کے برابر تھی قتیسل
چھو کے اُس پارکس بدن کو میں تو مونا ہو گیا



اپنی اپنی سوچ کے صحراؤں میں
ہم بچھاتے ہیں گولے پاؤں میں

جب سنی ہم نے پیسے کی صدا
جا بے بیٹی ہوئی برکھٹوں میں

دل کے دروازے پر دستک سی ہوئی
گھنٹیاں بجنے لگیں آشاؤں میں

خود ہی تھے موجود استقبال کو
ہم گئے جس شہر میں جن گاؤں میں

چاند تاروں میں کیا جس کو تلاش
وہ تھا میرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں

ہم کھڑے تھے دوڑتوں کے دریاں
دھوپ میں وہ جل گیا میں چھاؤں میں

جاٹے دریا سمندر سے قسطل
ندیاں گرتی رہیں دریاؤں میں



Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کیڑا، رزق اور پتھر

تُو ہے تجس کا غوگر تو پہلے
پر بت سے پتھر نکال
پتھر کو توڑ اور پھر دیکھ اُس میں
کیڑا ہے اک بے مثال
صدیوں سے پتھر ہی مسکن ہے جس کا
اور اس کا یہ ہے کمال
پتھر کے اندر وہ رہ کر ہمیشہ
پاتا ہے رزقِ حلال

لیکن جو پتھر سے آجائے باہر
 جینا اُسے ہو محال
 باہر کی دُنیا —
 مالِ حرام اور لالچ کی منڈی
 سرمایہ داروں کی رنڈی
 باہر کی دُنیا —
 اندر سے کالی

انسانیت کے لیے ایک گالی
 اِس میں ہے خواب و خیال
 اے دوست —! رزقِ حلال



وہ شخص جس کو مری زندگی میں آنا تھا
 سنا ہے اُس کے تعاقب میں اک زمانہ تھا
 نہ تھا پسند کسی کو بھی دل کا دل سے ملاپ
 مگر ہمیں تو ویسے سے دیا جلانا تھا
 نہ جانے بھیگ چلی کیوں ہماری پیشانی
 ہمارے سر پر تو سورج کا شامیانہ تھا
 بہت عروج پہ جب تھے ہمارے قول و قسم
 ہمارے پیار کا وہ آخری زمانہ تھا



بہت قریب، بہت ہی قریب تھا صیاد
 قفس سے دُور بہت دُور آشیانہ تھا

تفیل تجھ کو ملی ہے اسی لیے شہرت
 کر ٹوس ج کی تنقید کا نشانہ تھا



نہ دلو لے وہ رہے اور نہ وہ زمانہ رہا
 سماں حیات کا لیکن سدا سہانا رہا

غزل حرام ہوئی، حُسن پر لگے پہرے
 ہر امزاج مگر پھر بھی شاعرانہ رہا

خُدا بھی مان لیا بندگی بھی کی اُس کی
 تعلق اُس سے مگر اپنا غائبانہ رہا

بکھا ہوا مرا ماضی تھا جس کے تنکوں پر
 مری اڑان میں مائل وہ آشیانہ رہا

پروں کے ڈھیر لگے ہیں ہاں ہاں اب بھی
جہاں جہاں کسی بچی کا آشیانہ رہا

کہیں کہیں کوئی راحت، کہیں کہیں کوئی غم
مرے نصیب کا منظر وہی پرانا رہا

قتیل ترکب مراسم وہ کر گیا، پھر بھی
سلوک اُس کا مرے ساتھ دوستانہ رہا



اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کتا ہے
کوئی نہ ہو تو مجھے وہ بُرا بھی کتا ہے

مرے خدا، اُسے جھٹلاؤں کس بہانے سے
وہ اجنبی تو مجھے آشنا بھی کتا ہے

میں اس کے دو غلے پن سے بہت ہی عاجز ہوں
وہ مجھے سے پیار کو اپنی خطا بھی کتا ہے

ہوا ہے اپنا تعارف اک ایسے موسم سے
جو آنندھیوں کو خرام صبا بھی کتا ہے

نوادرات کی قیمت پہ جن کو بیچ سکے
زمانہ ایسے بُہتوں کو حُسنِ راہی کہتا ہے

تقیّلِ تُو کبھی داعِظ کا اعتبار نہ کر
مذاق سے وہ تجھے پارسا بھی کہتا ہے

لفظوں کی بائنی کا سانپ

کب سے چند لبوں کے پیچھے
رینگ رہا ہے دھیرے دھیرے
لفظوں کی بائنی کا سانپ
یوں لگتا ہے
چند لبوں سے آگے بڑھ کر
یہ زہریلا سانپ کئی ہونٹوں تک جانا چاہتا ہے
بتلاتی ہے کینچی اس کی
بنا ہوا بارود کا ہے اس کا پیکر
ٹھلسائے جو نظرِ نظر کو، بدنِ بدن کو
خطرہ جس سے ڈگر ڈگر کو، چین چین کو

خوف کے مارے آنکھ اٹھا کر کوئی نہ اس کی جانب دیکھے
لیکن تو کیا واقعی اس کو دیکھنا چاہیے؟
بڑے شوق سے دیکھ !

لیکن تیرے لیے ہے بہتر
پہلے تو اپنی آنکھوں کو

ڈھانپ لے ٹھنڈے پانی کی عینک سے

اور کنکھیوں سے اس کے زہریلے پن کو بھانپ

تب تو ٹھیک سے جان سکے گا

کیسے تیرے پاؤں سے کچلا جاسکتا ہے

لفظوں کی بائیں کا یہ زہریلا سانپ



صرف ترے ہاتھوں کو چوموں تیری بیعت چاہوں

سو در چھوڑ کے تیری ایک حسین کرامت چاہوں

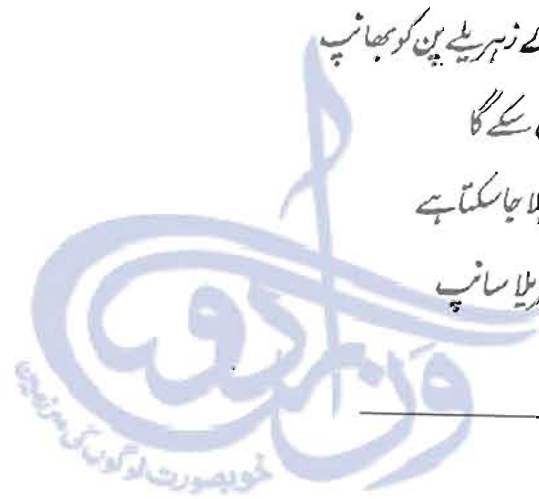
تھوڑے تھوڑے دن کاٹے ہیں کتنی ہی گلیوں میں
آخری بار ترے دل میں اسے دست سکونت چاہوں

آئیں کوئی ڈھنگ رکھاؤں تجھ کو بے چینی کا

تیرا دوست ہوں اپنی سی تیری بھی حالت چاہوں

تیرے ذہن کی چاندی اور تیرے جذبات کا سونا

اپنا جسم لٹا کر بھی میں صرف یہ دولت چاہوں



اوپر والا پوچھ ہی بیٹھے مجھ سے تو میں بُزدل
تجھ سے کھل کر باتیں کر سکنے کی ہمت چاہوں

بے غرضی کی آخری حد پر بنا قاتل جو ساتھی
وہی تو ہے اک شخص جسے میں بننا ضرورت چاہوں



چاند بھی راہ میں کیا ہے روشن پھر بھی کوئی نہ آیا
رات گئے حیران کھڑے ہیں میں اور میرا سایا

ستاٹے کے رنگ ہیں لاکھوں کس کس کو پھپھو
میں نے اک پل چا پٹنی اور برسوں دھوکا کھایا

دھوپ کا بھی اک روپ ہے یارو گرم گلابی لیکن
اکثر ٹھنڈے بھونکوں سے بھی رنگ ہرا ستلایا

روتا کیسا ؟ ڈھانپ کے منہ اب میں آہیں بھرتا ہوں
ڈرتا ہوں کہیں جاگ نہ جائے کوئی ہراسا

ہم بے داغ بدن والوں کو نیم برہنہ کر کے
ہر کوڑھی نے اپنے بدن پر اوڑھ لیا سرمایا

اپنے اپنے درد کے اندر چھپ گئے ساتھی سارے
زخموں کے اس موسم میں کون اپنا کون پرایا

ساتھ ہمارا کبھی نہ چھوڑا یا رقتِ سیل قلم نے
دردِ اس دنیا میں کس نے کس کا ساتھ نبھایا

خون کی دشتک

ٹاپے گا مرا دیوانہ پن
زنجیر پہن کر چھن چھن
اے دوست نہ رستہ روک مرا
اے دُنیا تو دیوار نہ بن

آزاد ہوا تھا میں پیدا اور مرنے تک آزاد ہوں میں
انکار ہے جس کی فطرت میں اُس آدم کی اولاد ہوں میں
شامل ہے مری مٹی میں اگن
اے دوست نہ رستہ روک مرا
اے دُنیا تو دیوار نہ بن

مجبوروں کا میں ہمدم ہوں اور ساتھی ہوں کمزوروں کا
میں ساتھ کبھی دے سکتا نہیں ان کالے پیلیے چوروں کا
یہ سب ہیں ترے میرے دشمن
اے دوست نہ رستہ روک ہرا
اے دُنیاتُو دیوار نہ بن

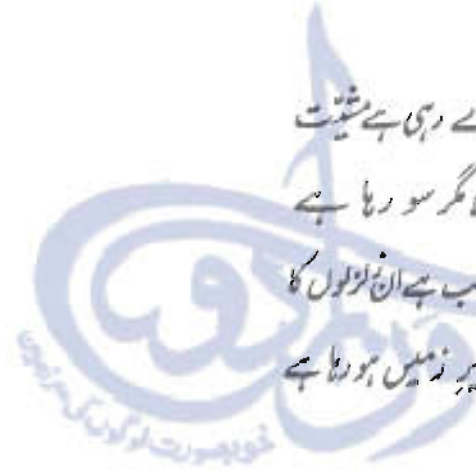
احساس کے موتی ہیں جس میں من ساگر کا وہ سیپ ہوں میں
روشن جو اندھیرے گھر کر دے وہ جگمگ کتا دیپ ہوں میں
آزاد ہے میری کون کرن
اے دوست نہ رستہ روک ہرا
اے دُنیاتُو دیوار نہ بن

ظالم کو جس نے لٹکارا وہ شیریں جیسا رہوں میں
جن لوگوں پہ کوئی ظلم ہوا ان لوگوں کا ہمدرد ہوں میں
ہر ایک وطن ہے میرا وطن
اے دوست نہ رستہ روک ہرا
اے دُنیاتُو دیوار نہ بن

میں اپنے خُون کی دستک سے انسان کی آن جگاؤں گا
تم یہ نہ سمجھنا تیروں سے شمشیروں سے ڈرجاؤں گا
میں باندھ چکا ہوں سر پہ کفن
اے دوست نہ رستہ روک ہرا
اے دُنیاتُو دیوار نہ بن
ناچے گا ہرا دیوانہ پن

زلزلے

دشکیں دے رہی ہے شہیت
سوئے والا مگر سو رہا ہے
کچھ تو مطلب ہے ان زلزلوں کا
کچھ تو زیرِ زمیں ہو رہا ہے



اسیری کے نشاں سارے کے سارے بر محل رکھنا
جہاں چھنکی ہوں زنجیریں وہیں زلفوں کے بل رکھنا

تمہیں بے کیف کرنے کو نہ جانے کب بدل جائیں
اُن آنکھوں کا تم اپنے پاس کچھ نعم البدل رکھنا

رہا ہے ربطِ میری شاعری کا اس کے ہونٹوں سے
مگر جائے تو اُس کے سامنے میری غزل رکھنا

کبھی اپنی جفا پر وہ پشیمیاں ہو بھی سکتا ہے
مگر تم فیصدِ ترکبِ مجتبت کا اٹل رکھنا

ہزاروں آرزوؤں کو بسا بیٹھے ہو کیوں دل میں
نہیں آسان گھر میں اتنے مہماں آج کل رکھنا

ہواؤں سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر دائرے جس میں
قتیل اُس جھیل میں ہو لے سے یادوں کے نول رکھنا



اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا
تمناؤں کی ہر وادی میں آہستہ قدم رکھنا

حیمنوں کی وہ محصل ہو کہ دربارِ شہنشاہی
کہیں اچھا نہیں ہوتا سرِ تسلیم خم رکھنا

دلوں میں پیار ہے اپنا، بلوں میں اس کا سر پایا
مدد کے سامنے یا رب تُو ہی میرا بھرم رکھنا

اُسے یس ڈھانپ لینا چاہتا ہوں اپنی ٹیکوں میں
الہی اُس کے آنے تک ہری آنکھوں میں دم رکھنا

یہی کچھ درمیان دین و دنیا ہم نے دیکھا ہے
لگانا نو خدا سے اور پسلو میں صتم رکھنا

قتیل اب بھی سیمائی کا دعویٰ ہے انھیں لیکن
کرم کی اس اپنے قاتلوں سے پھر بھی کم رکھنا

ایک انوکھی لڑکی

انگ ہے اُس کا پھول سا رنگ ہے لال گلاب
دل موہ لینے میں اُسے حاصل بڑا کمال
ایک نظر میں کھینچ لے جاتے راہیوں کو
جادو اُس کی بھانجھنیں مقناطیس جہاں

ماٹھا اچلے چاند سا ہونٹ اس کے عتاب
لڑکی ہنستی بولتی، جیسے کھلا گلاب
محبوبہ اُسے جان کے پیش کیا جو پان
کہہ دے گی وہ آپ سے ”بھیتا جی آداب“

کبھی سراسر مہر ہے، کبھی وہ قہر ہی قہر
 وہ لڑکی کے رُوپ میں کچھ اُمت کچھ ذہر
 کوئی نہ سارے شہر میں جانے اس کا نام
 پھر بھی اُس بے نام کو پہچانے سب شہر



اُس کی زلف کے سائے سائے چلا کرو
 جلتے لوگو — کچھ تو اپنا مہلا کرو

پیار کی آنچ نکھار کا باعث بنتی ہے
 جلتا ہے تو پیار کی آگ میں جلا کرو

پیڑ یہاں کچھ سدا بہار بھی ہوتے ہیں
 کوئی موسم ہو تم پھولا پھولا کرو

کوئی منظر پاؤں کی زنجیر نہیں
 وادی وادی آزادی سے چلا کرو



جان بچاؤ تنگ نظر انسانوں سے
کچھ اپن کچھ خلقِ خدا کا سبلا کرو

پھندا جس کو پورا، پھانسی چڑھے وہی
کس نے کہا تھا سامنے اپنا گلا کرو

غم کو اور بڑھاتی ہے یہ ہنسی قتیلس
چہرے پر یہ عذرا کم کم نکلا کرو



اس دھرتی کے شیشِ ناگ کا ڈنک بڑا زہریلا ہے
صدیاں گزریں آسمان کا رنگ ابھی تک نیلا ہے

میں ہوں اپنے پیار پر قائم اُن کی رسمیں وہ جانیں
اور ہے ذاتِ حسینوں کی اور میرا اور قبیلہ ہے

میرے اُس کے ہونٹ بلیں تو کھلیں ہزاروں پھول مگر
کچھ تو میں چُپ رہتا ہوں کچھ یار مرا شرمیلا ہے

آنسو ٹپکے ہوں گے ان پر، حرفِ جہی تو پھیل گئے
رویا ہے خط لکھنے والا، جہی تو کاغذ گسیلا ہے



میں نے کہا دو اجنبیوں کے دل کیسے مل جاتے ہیں
پیارے بولی اک دیوی یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے

یوں ہی تو نہیں کہتا رہتا نظمیں، غزلیں، گیت قلیل
یہ تو کسی کی محفل تک جانے کا ایک وسیلہ ہے



یوں لگتا ہے لاش ہماری موم کا پھنٹے ہوئے کفن ہے
پھینکے گئے سمندر میں ہم پھر بھی اپنا خشک بدن ہے

کیوں تالاب میں عکس ہمارا صاف نظر نہیں آتا لوگو
یا کچھ مسخ ہے چہرا اپنا، یا پانی میں گدلا پن ہے

کون سا بدلہ ہم سے لینے بھیجی گئی برسات فلک سے
کہاں سے بچ کر گزرے کوئی ساری گلیوں میں بھیلن ہے

رب کو خوش کرنے کے بہانے کرے دل آزاری بندوں کی
اک موذی بس اسی کام میں بڑے خلوص کے ساتھ مگن ہے



اُسی کے گھر سے ہوگا برآمد لٹا ہوا سب مال ہمارا
ہم رہبر سمجھے تھے جس کو وہ اک شستینی رہزن ہے

ہر بن باسی ہے خطرے میں جاننا چاہیے ہر بیت کو
جہاں کہیں ہے کوئی لشکا وٹاں کا راج پتی راون ہے

کون بتائے کس ظالم نے آکر توڑ دیے سب جھولے
چُپ ہیں کوئلیں اور پیسے خوب قتل آج کے راون ہے



Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

میلی روشنیال

سُن کر شور فضا میں تیز ہواؤں کا
چار طرف واویلا ہوتے دیکھا ہے
گرد اُڑاتی آنکھوں کے چھو لینے سے
روشنیوں کو میلا ہوتے دیکھا ہے



کچھ ذی ہنر جو بے ہنروں کی طرح پیچھے
اپنے ہی گھر میں در بہ دروں کی طرح پیچھے

انساں کو چاہیے کہ مسافر نواز ہو
جنت پیچھے ہرے شجروں کی طرح پیچھے

رکھے وہ اپنی آنکھوں پر اپنا بریدہ سر
جو چاہتا ہو دیدہ وروں کی طرح پیچھے

دین بے وجود

تو کئی بار ہوا قتل مگر اے مرے دل
ترے مرنے پر یہ دنیا کبھی روٹی بھی نہیں
تیرا مذہب تو ہے بس مذہب انسانیت
اور اس نام کا مذہب یہاں کوئی بھی نہیں

جن کے سروں میں کیفیت تھا اوروں کے واسطے
ہم اُن اُداس نعمت گروں کی طرح پیچھے

مُحکمت قلیل ہم کو نہ آیا تمام عمر
جب تک پیچھے کشیدہ سروں کی طرح پیچھے



افشاں اک جھلک میں کہانی وہ کر گیا
اپنے بدن سے شعہ سبانی وہ کر گیا

بھونکا لگا وہ ٹچے کو بسنتی ہواؤں کا
آیا تو میری شام سہانی وہ کر گیا

لکھ کر چلا گیا، مرے پھرے پہ اپنا غم
مجھ کو عطف عجیب نشانی وہ کر گیا

سو جان دے کے بھی نہ کہی کو وفا طے
دل کے تگر میں ایسی گرانی وہ کر گیا



اب اُس کی چال دیکھ کے بہتی ہیں ندیاں
پابند پانیوں کی روانی وہ کرگیں

مُجھ سے انا پرست نے چاہا اُسے قتل
پتھر کو اپنی آنچ سے پانی وہ کرگیں

روئے نعمت

اونچے محل میں جس طرف جاکر وہاں یلعن کر کر
رکن من برس، دم جھم برس، چھابوں برس، چھم چھم برس
لیکن برا کچا مکان شاید نہ تجھ کو سہہ سکے
بلکہ اے ابر کرم! مسیری طرف کم کم برس





غبارِ رہگزر جب پردہِ محفل پر گرتا ہے
ہر اک ذرہ کسی محفلِ نشیں کے دل پر گرتا ہے

کسی پیاسے کو پانی جس طرح مل جائے صحرا میں
تھکا ہوا مسافر اس طرح منزل پر گرتا ہے

اڑاتی ہے مذاق اس کا بھنور کی حشر سامانی
کسی قلعہ کا پتوار جب ساحل پر گرتا ہے

تجھے دے گا رعایت اس غلط فہمی میں مت رہنا
عتاب اس کا جو گرتا ہے تو سب محفل پر گرتا ہے

تَحْفِظ

جہاں میرے بھٹک جانے کا اندیشہ ہوا پیدا
وہیں رستہ دکھایا دودھ جیسی کچھ صداؤں نے
کوئی خطرہ قسquil آیا جو نہی مجھ پر بھینٹنے کو
مجھے اپنے پروں میں لے لیا ماں کی دُعاؤں نے

رعونت سے جسے پھینکا گیا ہو بے گناہوں پر
دہی خنجر پلٹ کر سینہ قاتل پہ گرتا ہے

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پر کہہ دو قیل اُن سے
جو دامن پر نہیں گرتا۔ وہ اُنسو دل پہ گرتا ہے



ضروری چیز جو مانگو دہی اکثر نہیں دیتا
وہ کرتا ہے عطا شرم دیا، چادر نہیں دیتا

سگوں کو تو اجازت اس نے دی ہے کاٹ کھانے کی
حفاظت کے لیے ہم کو مگر پتھر نہیں دیتا

زمانے سے انوکھی دین ہے اس دینے والے کی
وہ دیتا ہے درو دیوار سیکن گھر نہیں دیتا

اکیلا حرف ہوں اور داستاں بننے کی حسرت ہے
مگر مجھ پر توجہ وہ فسانہ گر نہیں دیتا



کمانی ختم ہوئی

اپنی اکلوتی بہن بیگم اختر اورنگ زیب کے لیے
جو ۱۱- مئی ۱۹۸۶ء کو اچانک تجھے تنہا چھوڑ گئیں

کھلی جب آنکھ مری، اپنی ماں کے پہلو میں
تو پہلا باب کمانی کا ہو رہا تھا شروع
لبوں پر حریف نکھرتے نہ تھے مگر پھر بھی
یہ آرزو تھی کہ ہو ایسی کوئی شکل طلوع
جو تجھ کو اپنے خد و خال سے نہال کرے
جو میرے چہرے کو سونپے سب اپنے نقش و نگار
جسے میں سونپ سکوں اپنا رنگ رُپ تمام

مجھے تو یوں لگے جیسے کفن پر ہے نظر اُس کی
میں ہے تو کیوں مردوں کو زندہ کر نہیں دیتا

سنا ہے کھول بھی دیتا ہے وہ پنجرے کا دروازہ
مگر اڑنے لگیں بچی تو ان کو پر نہیں دیتا

عنایت ہے قاتل اس کی فقط کچھ خاص لوگوں پر
سنی وہ ہے تو پھر کیوں میرا دامن بھر نہیں دیتا



کوئی اگر اُسے دیکھے تو مجھ کو یاد کرے
سو ایسا ہو کے رہا —

جب اس کی آنکھ کھلی اپنی ماں کے پہلو میں
اک اور باب کمانی کا ہو گیا تھا شروع
جو ایک شکل نظر آئی ماں کے بعد اُسے
وہ میری شکل تھی

اور میری شکل میں شامل

اُسی کے نقش اُسی کا جیل چہرہ تھا

وہ میری شکل کے آئینے میں تھی عوایے

کہ صوف میرے خدو خال اس کے دھیان میں تھے

وہ اپنی ذات بری ذات میں سموئے تھی

کہ میری آنکھوں میں جو اُس کا عکس تھا وہ بھی

بری ہی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا

وہ ماں کی گود سے مجھ کو ہمک ہمک کے ملی

کہ جیسے میری تمناؤں کے سبھی سائے

پڑے ہوں صبح ازل اُس کے بھی خیالوں پر

اور اس نے میری تمام آرزوئیں
گھول کے گھٹی میں جیسے پی لی ہوں۔

کمانی آگے بڑھی

ایک باب اور کھلا

مجھے اگر کوئی پتھر لگا تو وہ تڑپی

اگر کبھی مرے ماحول نے ستایا مجھے

آنکھ اُس کی بھر آئی

اگر کہیں سے کوئی تیر مجھ پہ پھینکا گیا

ڈھال اُس کے ہاتھ بنے

اگر کبھی مرے حالات مجھ سے رُڈھ گئے

جا کے وہ منالائی

اگر کبھی مجھے شکوہ ہوا زمانے سے

اُسی نے زندگی نو کا حوصلہ بچا

جو مسکراہٹیں مرے ہونٹوں پہ آگئی ہیں کبھی

اُسی کی دین تھیں وہ

جو منزلیں مرے قدموں پہ مہربان ہوئیں

تو اُس کی راہبری کا کمال تھا یہ بھی
نماز اس لیے پڑھتی رہی کہ میرے لیے
دُعا کوئی نہ کوئی وہ خدا سے مانگ سکے

کہانی آگے بڑھی

نکتہ عروج آیا —

اک ایسے وقت کو لے کر، کہ اس کی مشعلِ جاں

برے لیے ہی نہیں جل رہی تھی سب کے لیے

وہ روشنی کی علامت تھی زندگی کا نشان

اُسے شعور تھا آدابِ آدمیت کا

وہ مسکراتے ہوئے سب کے غم بٹاتی رہی

جو سب کو راہ دکھاتی رہی وہ میری بہن

اکیسی آج اک ایسے سفر کو چل نکلی

جہاں سے لوٹ کے آیا نہ کوئی آج تک

کہانی ختم ہوئی —



چمک آتی ہے آنکھوں میں کبھی کچھ سائے آتے ہیں

اُسے تو بات کرنے کے بھی پیرائے آتے ہیں

خریدار اپنا ہوسکتا نہیں کمتر زینما سے

جھی تو ہم سربازار بن شرمائے آتے ہیں

ہمیں اب محضِ خواباں تک آتے ہیں تال ہے

مگر جب وہ بُلا بھیجے تو سر نہ ہٹائے آتے ہیں

ہماری خامشی نے کر دیا حساس لوگوں کو
لگے پتھر ہمیں تو جوش میں ہمسائے آتے ہیں

قتیل اہل و عیال اپنے جنہیں فرصت نہیں دیتے
دکھی بہنوں کو اکثر یاد وہ ماں جائے آتے ہیں



اگر وہ شخص خود چل کر تھارے پاس آیا ہے
تو اُس کی جیب میں سرمایہ احساس آیا ہے

گیا تھا نوکری کرنے عرب کے تاجداروں کی
بڑے آرام سے وہ کاٹ کر بن باس آیا ہے

بنا سکتا تھا جو اپنے قلم سے دل کی تصویریں
وہ بن کر صرف اپنے جسم کا عکاس آیا ہے



ہوم سیک

(HOME SICK)

(سات سمندر پار کی ایک سوچ)

نہ اس سے میری دشمنی نہ اس سے مجھ کو بُر ہے
اس ایک شہر میں ہزار جنتوں کی سیر ہے
مگر نہیں —

دیوار غیر پھر دیوار غیر ہے

بڑے حسین زاویے کبھی تھے میری سوچ کے
مگر کسی نے رکھ دیا مرے پردوں کو فوج کے
چلا تھا آسمان کو، زمیں پر آگرا ہوں میں
جو ٹوٹ کر بکھر گئے وہ خواب چن رہا ہوں میں
سنا تھا اس دیار میں ہر آدمی کی خمیر ہے
مگر نہیں —

دیوار غیر پھر دیوار غیر ہے

نفیست ہے کہ جاں دے کر ملی فریاد کو شہرت
وگر نہ جذبہ ایشیا رکس کو داس آیا ہے

قتیل اب ساحلوں کی ریت بھی ہوجس کی مٹھی میں
سمجھ لینا وہ لے کر گوہر و الماس آیا ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



اگرچہ ہر طرف یہاں برس رہی ہے زندگی
وہ پیاس ہے کہ نہر کو ترس رہی ہے زندگی
یہ زندگی دکھوں میں ہم گزارتے ہیں جس طرح
کرے طول آدمی اسے قبول کس طرح
یہ ٹھیک ہے، ملا ہوا یہاں حرم سے دیر ہے
مگر نہیں —

دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

گھٹا گھٹا ہے دم مرا، صبا کو ڈھونڈتا ہوں میں
پھر اپنے دس کی کھلی فضا کو ڈھونڈتا ہوں میں
قدم بڑھاؤں کس طرف کروں میں کس سے شورو
کہاں ہے میرا یقرا، کہاں ہے میرا ایشیا
یہاں تو اپنی زندگی سکون کے بغیر ہے
نہیں نہیں —

دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے



جو پل صراط بناتے ہیں رہنمائی کی جگہ
وہ دھوپ لاکے نہ رکھ دیں کہیں شجر کی جگہ

بلا دلوں کا بہت زور ہے مرے آقا
صدف سے ریت نکلتی ہے اب گہر کی جگہ

کہاں سے مانگ کے لائیں وہ لوگ بینائی
بلا فریب نظر جن کو اک نظر کی جگہ

وہاں جھکا یا گیا سر علوم و دانش کا
عیوب ہیں جہاں مسند نشین ہنر کی جگہ

جو بن بلائے مسائل یہاں چلے آئے
پسند ہے برا گھراُن کو اپنے گھر کی جگہ

قتیل تجھ کو بے کیادہاں پیامِ سحر
سکوت کا ہو تسلط جہاں گجر کی طرح



خوش رہ کے بھی آنکھوں سے بات کرتا ہے
وہ چاندنی کے تکلم کو ماست کرتا ہے

گلے ملے نہ ملے، کم مصافحہ بھی نہیں
معطر اب بھی ہمیں اُس کا ہاتھ کرتا ہے

نبھا رہے ہیں کچھ ایسے ہم اُس سے یارا نہ
عبور جیسے کوئی پُل صراط کرتا ہے

نہیں ہے کم کسی شب زندہ دار سے وہ شخص
بسر جو آنکھوں میں فرقت کی رات کرتا ہے



احتساب

ٹوٹ بھی جائیں دُنیا بھر کے اُٹنے
کیا یہ گر گٹ جیسے رنگ بدلتے چہرے
بچ جائیں گے بھیلوں اور تالابوں سے؟

روانگی کی اجازت عطا کرے بھی تو عشق
ہزار تہمتیں عاشق کے ساتھ کرتا ہے

جو مہرباں ہو کسی پر کوئی حسیں قاتل
کہاں پسند وہ زہر حیات کرتا ہے

ست سے نام تھے اُس کی بہت سی غزلوں میں
پر اب قاتل ذرا احتساب کرتا ہے



شوقِ جلوہ ہے مگر ذوقِ نظرِ نابینا ہے
آئینے کے سامنے رکھا ہوا آئینہ ہے

صرف اک نظارہ دے کرے گیا آنکھیں کوئی
زندگی نے جو دیا اُس سے زیادہ چھینا ہے

پیاکس یوں بھڑکی ہری احساں ایندھن بن گیا
حسرتوں کی آگ سے روشن مرا اب سینہ ہے

منزلِ مقصود

جلا دوں سے خوف آئے جس غیرت کو
وہ غیرت بازار میں حب کر چھوڑ آؤ
جن لفظوں کا حُسن قلیلِ خوش آمد ہو
انہیں کسی دربار میں حب کر چھوڑ آؤ

ان دنوں میں صبر کی دولت سے مالا مال ہوں
یہ مرا حق تھا اسے زخموں سے میں نے چھینا ہے

دشمنوں کے ہاتھ آخر یک گیا وہ بھی قتل
اک چھپا قاتل جو میرا ہمدرد دیرینہ ہے



کرہے تھے قریہ قریہ زندگی کی جستجو، میں اور تُو
ہو گئے آوارگی کے نام پر بے آبرو، میں اور تُو

تھے جہاں رسموں رواجوں کے اندھیلوں پر فلا، اب اُس جگہ
معذرت بن کر کھڑے ہیں روشنی کے دُور، میں اور تُو

کچھ دنوں سے میں تری اور تُو مری مہمان ہے کیا شان ہے
بن چکے ہیں عکس جاں اک دوسرے کا ہُو، میں اور تُو

آج کی ساری بہاریں آج کی ہر اک غزائے نامہاں
مُت نہی کب آئے گی کب ہوں گے آفر غر و غم، میں اور تُو



کل بھی اپنی ذات میں ہم سرمد و منصور تھے، سرمد تھے
کر رہے ہیں آج بھی ذوقِ انا کی آرزو، میں اور تو

یہ ضروری تو نہیں صرف و صدا پُر زور ہو، اک شور ہو
بند ہونٹوں سے بھی کرتے آرہے ہیں گفتگو، میں اور تو

اس گلستاں میں قلیل اب نعلی کے راز داں ہوں گے کہاں؟
دو ہی رہ جائیں گے باقی طائرانِ خوش گلو، میں اور تو



رُو برو وہ ہے عبادت کر رہا ہوں
اُس کے چہرے کی تلاوت کر رہا ہوں

لو خریدو اک نظر کے مول مجھ کو
اپنی قیمت میں رعایت کر رہا ہوں

لی ہے صبر و ضبط نے مجھ سے اجازت
اپنے مہمانوں کو رخصت کر رہا ہوں

چھن گیا ملکِ جوانی بھی تو کیا غم؟
اب بھی یادوں پر حکومت کر رہا ہوں



فلش بیک

FLASH BACK

بہی کی ایک شام
میں نے کی تھی جو کبھی
اک دلربا دیوی کے نام

وہ شام یاد آنے لگی
دھڑکن مری گانے لگی
کھٹکے مری یادوں کے جام

کوئی بھی غم اُس کو لوٹایا نہیں ہے
یوں امانت میں خیانت کر رہا ہوں

اُس نے تو بس اک ذرا سی بات چھڑی
میں وضاحت پر وضاحت کر رہا ہوں

عشق کر کے آپ بھی بن جائیں انسان
شیخ صاحب کو نصیحت کر رہا ہوں

عاشقی طوفانِ گریہ چاہتی ہے
اور میں آہوں پر قناعت کر رہا ہوں

آسمان جو شخص ہے سب کی نظر میں
اُس کو چھو لینے کی جرأت کر رہا ہوں

میں نے دیکھا ہے قلیل اُس کا سراپا
میں کہاں ذکر قیامت کر رہا ہوں

میں ذرا سا کھو گیا
 جیسے نشہ سا ہو گیا
 کرنے لگا خود سے کلام

شاعر تجھے کچھ یاد ہے
 وہ بُت جہاں آباد ہے
 اپنا دہاں جانا تھا عام

پر وہ زمانہ اب کہاں
 رنگینیاں وہ سب کہاں
 اٹھکی نہ اب یادوں کی تمام

تُو یاد کرتا ہے کسے؟
 بھیجا نہیں تُو نے چمے
 لاہور سے کوئی پیام

پر مجھ کو اُس پر بھی ہے شک
 تُو کمر رہا ہے آج تک
 جس کے لیے نیندیں حرام

وہ مورتی مر مر کی ہے
 آخر تو وہ پتھر کی ہے
 اُس کو بھی کیا اب تجھ سے کام

میں کیا کہوں کیسی ہے وہ
 جیسا ہے تُو ویسی ہے وہ
 دونوں مسافر بے مقصد

مست جا پڑانے دور میں
 تُو بھی من لاہور میں
 اب بمبئی سی کوئی شام
 افسانے کو دے اختتام



پیتا ہے خون اپنا، حالات کے گلوں میں
انگور دوڑتا تھا، جس شخص کی رگوں میں

بے آب سے یہ پھرے جذبوں سے ہیں جو ماری
کیا ڈھونڈتے ہو یا رو، ان کا بچ کے گلوں میں

ہر چہرہ معتبر ہے، کس کس سے بچ کے چلے
ہم گھر کے رہ گئے ہیں اس شہر کے ٹھگوں میں

ہاتھیوں کا لشکر

چار سو بڑھتے اندھیروں سے نہ ڈراے گل زمینیں
رات پھیلے گی تو قسملیں بھی آئیں گی یہاں
ہاتھیوں کا ایک لشکر سامنے ہے بھی تو کسب
سنگ درمنقار ابابلیس بھی آئیں گی یہاں

بیکار ہو چکے ہیں ، انبار پتھروں کے
لوہے کی کھال جبکے ، بانٹنی گئی سگوں میں

کس کام کا قتیل اب یہ دوپہر کا سونا
برباد عمر کر دی ، تم نے تو رت بگوں میں



کیا حین آنچ ہے مگر قریب جائے کون
اُس بدن کو چھو کے اپنی انگلیاں جلائے کون

کھو گئے جو گیسوؤں کے ریشمی طلسم میں
اُن کو واپس اپنی اپنی چھاؤں میں بلائے کون

کس کے عشق میں ہے دم کہ تاج اک نیا بنے
اب دوبارہ پتھروں کو چاندنی پلائے کون

کس کے ہاتھ آسکی ہیں بادلوں کی ٹولیاں
مٹھیوں میں بند کر سکا ہے ان کے سائے کون

دو عادتیں

میری دو عادتیں تھیں
ایک سگریٹ — ایک محبوبہ
کہا احباب نے مجھ سے
کہ محبوبہ کو چھوڑا جا بھی سکتا ہے
مگر سگریٹ نہیں چھوڑتا —

کہا میں نے
کہ اے میرے جہاں دیدہ رفیقو، دوستو
میں لو —

شہر میں عجیب سی خبر اڑی ہے قتل کی
اُس گلی میں اپنی لاش دیکھنے کو جائے کون

جب نہ ہو گا ایک بھی مسافر اس زمین پر
تب چلائے گا بھلا یہ کارواں سر لٹے کون

سارے موسموں کی ہے قتل جب خبر ہمیں
بجلیوں کے واسطے پھر آشیاں بنائے کون



تھارے تجربوں سے معذرت کرتے ہوئے
سگرٹ کو پھڑا آج سے میں نے
مگر وہ میری محبوبہ —؟

وہ اب دہرا سرور زندگی دینے کو
سگرٹ کی طرح میرے لبوں کی لاج رکھے گی
نہ ہونے دے گی سگرٹ کی کمی غمکس وہ مجھ کو
— مری اب ایک ہی عادت ہے

محبوبہ —



ایک گم مُنم فضا کے سوا کچھ نہ تھا میری چُپ چاپ حیرانیوں کے لیے
اب کے ساون میں بھی میں ترستا رہا گنگناتے ہوئے پانیوں کے لیے

جب بھی نیکی بدی کا پڑا رن کوئی، جو بھی ناصح تھا وہ پیٹھ دکھلا گیا
سہ گئے ہم ہی محرومیوں کے رستم، رہ گئے ہم ہی قربانیوں کے لیے

کیا خبر کیا خیال آیا صیت دکو، اُس کے دل میں بھی اک نرم گوشہ بنا
اب رہائی کے پیغام آنے لگے تیرے خوددار زندانیوں کے لیے

جھونپڑوں میں سسکتی ہوئی بیویو! ہوں گے خالی تھائے لیے وہ محل
جو محل تاجداروں نے بنوائے ہیں اپنی پیاری مہارانیوں کے لیے



چاہے کوئی بھی ہو، کیوں غمناک کریں، عاشقوں سے تو یہ کام ہوتا نہیں
کوئی شاعر ہی بلووا لو دربار سے، گلِ رُخوں کی شناخانیوں کے لیے

جوش پر ہے طبیعت قلیل آج کل سامنے جو بھی آیا وہ بہر جائے گا
یہ ندی اک زمانے سے مشہور ہے اپنی مٹنے زور طغیانیوں کے لیے



باہر کی چمک بھی کیا کم تھی، پر بہت کچھ اس کے اندر تھا
یہ جان کے میں حیران ہوا، ہر لب و لہجہ میں ایک سمندر تھا

ڈا ہونا تھا جن ہونٹوں کو، اُن ہونٹوں پر اُننگی رکھ دی
اک شخص نے اس کو روک دیا، طوفان جو میرے اندر تھا

اپنے چہرے کو ترس گیا، جب پتھر برسے عبرت کے
تھا ریزہ ریزہ آئینہ، اور خستہ حال سکندر تھا

عزت بھی ملی شہرت بھی ملی، پر اپنے آپ میں سمٹ رہا
نودولتیوں کی دُنیا میں، اک شخص ققیل قلندر تھا



میں خُدا سے کیا کہوں؟

حضرت عیسیٰؑ کو جب مصلوب کرنے آئے لوگ
 تاج کانٹوں کا سجایا اُن کے سر پر
 پاؤں اور ہاتھوں میں کیلیں گاڑ دیں
 کچھ نے تھوکا اُن کے مُنہ پر
 کچھ نے اُن کو گالیاں دیں
 جب یہ سارے ظُلم اُن پر ہو رہے تھے
 آپ نے
 آسمان کی سمت دیکھا اور کہا
 اے خُدا! —
 تو انہیں کر دے معاف

گوئنگے میرے شہر کے

کچھ روز پہلے تازہ ہوا جن پہ تھی حرام
 وہ بھی دل و دماغ کے دُر کھولنے لگے
 اپنے وطن کی صورتِ حالات دیکھ کر
 گوئنگے بھی میرے شہر کے اب بولنے لگے

ان کو اشنا بھی نہیں معلوم
یہ کیا کر رہے ہیں۔

اور پھر صدیوں کے بعد
میں کہ صرف اک شاعرِ معتب ہوں
علیٰ نہیں

ایک چوراہے میں سب کے سامنے مصلوب ہوں
میرے درپے بھی ہر ماحول ہے
میرے پاؤں اور ہاتھوں میں بھی کیلیں گر چکی ہیں
اور میرے منہ پہ تھوکا جا رہا ہے
مجھ کو بھی دی جا رہی ہیں گالیاں

آسمان کی سمت میں بھی دیکھتا ہوں
دیکھتا ہوں اور دل میں سوچتا ہوں
میں خدا سے کیا کہوں —؟
میں کہ جو علیٰ نہیں



شرمندہ انھیں اور بھی اے میرے خدا کر
دستار جنھیں دی ہے انھیں سر بھی عطا کر
ٹوٹا ہے سدا جس نے ہمیں دوست بنا کر
ہم خوش ہیں اُسی شخص سے پھر ہاتھ ملا کر

ڈر ہے کہ نہ لے جائے وہ ہم کو بھی چرا کر
ہم لائے ہیں گھر میں جسے مہمان بن کر

اک موج دے پاؤں تعاقب میں چلی آئی
ہم خوش تھے بہت ریت کی دیوار بنا کر

ہم چاہیں کر بل جائیں ہمیں ڈھیر سے موتی
سیر بھی کسی بے نام سمندر میں لگا کر

درکار اُجالا ہے مگر سہمے ہوئے ہیں
کر دے نہ اندھیرا کوئی بارود جلا کر

لے اُس نے ترا کا سہہ جاں توڑ ہی ڈالا
جا کوچر قاتل میں ققیل اور صدا کر



بھائی ہوئی گھنگھور گھٹا ہے مرے سر پر
پھر بار سبُو آن پڑا ہے مرے سر پر

یہ گردِ مسافت ہے کہ منزل کا ہیولا؟
اب کون بتائے کہ یہ کیا ہے مرے سر پر

گو بیت چکا ہے وہ محبت کا زمانہ
تھوڑا سا مگر قرضِ وفا ہے مرے سر پر

حاصل ہے محبت مجھے اک جانِ سخن کی
بیٹھا ہوا کچھ دن سے ہما ہے میرے سر پر

شانزے لیزے

— پیرس کا خوبصورت مرکزی بازار —

اجنبی اور اجنبی —

تُن ہری آواز تُن

دیکھ مجھ کو غور سے

شانزے لیزے ہوں میں

تُو نے اپنے دلیں میں

نام تو میرا سنا ہوگا ضرور

میں کہ ایک بازار ہوں

خوبصورت باوقار

شہر پیرس کا سنگار

بے ساختہ یاد آیا ہے کوئی نہ کوئی دوست
پتھر کوئی جب آن لگا ہے مرے سر پر

تم چاہو تو دستار بھی کہہ سکتے ہو اس کو
ورنہ یہ تکبر کی سزا ہے مرے سر پر

بدے گا سماں ، پھول بنیں گے ہرے غنچے
اے دورِ خزاں ! دستِ صبا ہے مرے سر پر

جائے گا قتلِ اب بھی خطا ، وارِ عدو کا
میں جانتا ہوں میرا خدا ہے مرے سر پر

میری سڑکوں کے چمکتے پتھروں پر
 آج تیرے پاؤں کس شائستگی سے پڑ رہے ہیں
 کیوں کہ تو شاعر ہے نازک دل کا مالک
 اور شاعر ہی سمجھ سکتا ہے ہر دھرتی کے دکھ کو
 چاہے شاعر ہو کسی بھی دیس کا
 تو نے شائستگی لے لی ہوں گے وہ نرے
 جو رہے ہیں اب بھی میری خاک میں
 جن میں چلاتے ہیں
 ماضی کے بھیانک چار سال
 جب کہ ہٹلر اور اس کے چند ہرنیلوں نے
 میری خاک میں
 بوجھ دیئے تھے آمریت کے سلاسل
 تاکہ ان سے
 جو ر و استبداد کی زہریلی سنگینیں اگیں
 اور میری خوشنما سڑکوں پہ پلتے راہرو
 اپنے پیروں میں کریں محسوس پابندی کے زخم

درد کی شدت سے ان کے ذہن ان کے حلقے
 اپنی آزادی کی منزل بھول جائیں
 اور پھر
 سر جھکائیں آمریت کی سیہ دلیز پر
 غیر ملکی فوجیوں کے بوٹ جب روندیں
 مری تہذیب، میرے امن کو
 میری سرزمین اس قدر چھینیں
 کہ ان کے شور سے
 امن و آزادی کے سارے گیت
 چُپ ہو جائیں گونگوں کی طرح
 لیکن اے میرے مسافر
 میرے پیارے اجنبی
 ایک دن ایسا بھی آیا
 میری سڑکوں پر چمکتے پتھروں میں جاگ اٹھتی بھلیوں سے
 میری گلیوں میں بھرتے شہریوں کی انتقامی قوتوں سے
 میرے اُجڑے ریسٹورانوں میں دوبارہ زندہ ہوتی نمکی سے

میری مٹی میں تڑپتے گرم جذبوں کی عقابی جدتوں سے
میرے دریا سیں کی بڑھتی ہوئی طغیانوں سے
سر بلند "ایفل" کے معیار ہنر سے

میرے گرجوں کے گجر سے

شہر کے ایک ایک گھر سے

اٹھنے والی ایک سی آواز سے کھا کر شکست

جب غلامی کا ہر اک ظالم پیامی

اپنے آمراد جبر نیلوں سمیت

اس طرح بکھرا کہ دڑے بھی نہ بکھرے ہوں کبھی

اور اس دن —

اک نئے سورج نے یہ تحریر لکھ دی

اپنی کوئل روشنی سے

اب کوئی آمر نہ آنے پاٹے گا

پیرس کے اس بازار تک

شانزے لیزے جے کنتی ہے دنیا

شانزے لیزے جے جمہوریت سے پیار ہے



روشنی چاہیے صبا کے لیے

پھول روشن کرو خدا کے لیے

اُس کو اتن بھی مہرباں نہ کہو

ہم ترس جائیں گے دفا کے لیے

عشق کی انتہا کے معلوم

جان کافی ہے ابتدا کے لیے

بے گناہی جو شرط ٹھہری ہے

ہم کو چن لیجیے سزا کے لیے

پارسائی ہے بُزدلی کا نام
عصہ چاہیے خطا کے لیے

ہر کسی پر قاتیل کیوں آتا
دل تھا صرف ایک دلربا کے لیے



جسم کے جزیرے میں یہ جو دل کی وادی ہے
اس پہ راج ہے جس کا تُو وہ شاہزادی ہے

اپنے در پہ سجدوں کی راہ کیا دکھادی ہے
تُو نے میرے ماتھے پر زندگی سجاد دی ہے

تُجھ کو بھولنا چاہوں اور شکست کھا جاؤں
کتنی بے وقار اپنی قوتِ ارادی ہے

جستجو کے صحرا میں اب کہاں کوئی آنچل
میں نے اپنی چھاؤں بھی دھوپ میں گزار دی ہے



یاد کر کبھی اسے تاج تُو بھی اُس محبت کو
جس نے تیرے مرمر کو چاندنی پلا دی ہے

میرا ساتھ کیا دے گا شیخ بر سرِ محفل
وہ تو چُھپ کے بیچارہ جھومنے کا عادی ہے

دوست سب قَتیل اپنے مُل گئے رقابت پر
میں نے کوئی دل کی بات جب انہیں سُنا دی ہے

بے تعمیر

میں جب اپنی محبوبہ کے پیار سے ہاتھ کو چومتا ہوں

اُس دن پہروں جھومتا ہوں

اور گماں ہوتا ہے مجھ کو

میری طرح میری محبوبہ

رات گئے سونے سے پہلے

اپنے ہاتھ کے اُس حصے کو بڑے گھنڈ سے چومتی ہوگی

جس کی نذر کیا ہوتا ہے میں نے بوسے کا نذرانہ

یہ نذرانہ اپنی سوچ میں گھول گھول کر



دھڑکن دھڑکن تول تول کر
 ساری رات وہ جھومتی ہوگی
 پاؤں زمیں پہ نہ لگتے ہوں گے
 سوچ کی جنت میں وہ جب جب گھومتی ہوگی۔

اُس کو ناز کہ پُرجے اُس کو
 پاگل پن کی حد تک اُس کا ایک پُجاری
 مجھ کو اطمینان کر میں نے
 اُس کے نام پہ اپنی ساری عمر گزاری

میری عقیدت اور اس کی بے مہر محبت سدا پیچھے
 طاری ہے جو ہم دونوں پر
 وہ کیفیت سدا پیچھے
 سدا پیچھے وہ خواب جسے تعبیر سے نسبت کوئی نہیں



اے کاش تھے ایسا اک زخمِ جدائی دوں
 جب ٹیس کوئی چکے میں تجھ کو دکھائی دوں

جس روز کبھی تیرا دیدار نہ ہو پائے
 میں اپنی ہی آنکھوں کو نابینا دکھائی دوں

مغزور ہے تو کتنا صرف ایک صنم بن کر
 تُو پا ہے تو میں تجھ کو تن من کی خدائی دوں

تجھ سا کوئی دل والا محسوس کرے مجھ کو
میں گیت نہیں ایسا جو سب کو سُنائی دوں

اک عمر کے بعد اپنے چہرے پر کچھ ہے
میں کیسے قہقہے اس کو ہانپوں سے رٹائی دوں



دُنیا کو دکھانی ہے اک شکل خیا لوں کی
اُوں کہ بنائیں ہم تصویر اُجب لوں کی

پہل بھر کو مرے گھر میں آئی جو پری اُڑ کر
کی اُس نے بسر مجھ میں سورات وصالوں کی

ہم دیتے چلے جائیں کس کس کا جواب آخر
رفقار نہیں گھنٹی دُنب کے سوالوں کی

شاعر ہی تو دیتے ہیں تشبیہ گھاؤں سے
ہم قدر بڑھاتے ہیں تم گیسٹوں والوں کی



اسے دوست ادب اپنا پھر کیوں ہو صحت مند
بنتی ہیں ہری غزلیں خوراک رسالوں کی

بے چین قتیّل اُن بن ہم ہی تو نہیں تنہا
اُن کو بھی ضرورت ہے ہم چاہنے والوں کی

چاند، بڑھیا اور پتھر

اے طرب خانہ مشرق سے اُبھرتے ہوئے چاند
میں نے بچپن میں سنا تھا کوئی بڑھیا تجھ میں
اُن گنت صدیوں سے بیٹھی ہوئی چرخہ کاتے
اس روایت سے بہت دیر نہ چھوٹا دامن
بن گئی ایک حقیقت یہ ترے ہی ناستے

جب ذرا ہوش سنبھالا تو یہ سوچا میں نے
سُوت کے ڈھیر لگے ہوں گے تری دادی میں
سُوت — وہ جس سے بنا کرتا ہے مفلس کا لباس
ہوگا تقسیم کر ڈروں کی اس آبادی میں



لیکن اے چاند ترے شہر میں جب میں پہنچا
کوئی بڑھیا تھی وہاں اور نہ چرخہ کوئی
سُوت پھر سُوت ہے پانی تھا وہاں اور نہ ہوا
بے جی اڑھ کے سب تیری نفنا تھی سوئی

منتظر تھے ہری دھرتی کے برہنہ انساں
میں انھیں دوں گا ترے نور کے دھاگے لا کر
وہ بھی شرمندہ ہوئے مجھ کو بھی شرمندہ کیا
میں نے لا پھینکے جب اُن لوگوں کے آگے پتھر

رائیگاں جانہیں سکتا تھا سفند میرا کبھی
چاند پر سُوت کا اک تار بھی گرہل سکتا
یہ ندامت برے جھٹے میں نہ آئی ہوتی
پتھروں سے کوئی ٹیکس اگر بسل سکتا

اے طرب خانہ مشرق سے اُبھرتے ہوئے چاند



دن بھر ستانے کے لیے پیڑوں سے چھن کر آئی
میرے لیے اک تیرگی سورج پہن کر آگئی

میں زندگی کی تلخیاں جب چھوڑ جانے لگا
وہ شکل میرے سامنے دیوار بن کر آگئی

جو کچھ مجھے بخشا گیب کم تھا بہت۔ روزِ ازل
حیرت کہ پھر میری انا کس طرح من کر آگئی

چایا کہ شہرِ حُسن میں اُدبھی ہری گردن ہے
میرے مقابل عمر کی شمشیر تن کر آگئی

دورخ تھی جس کی زندگی، جس کا کوئی بچہ نہ تھا
شوہر کے گھر وہ بے نوا اک سوت جی کر آ گئی

واقعہ نہیں کیا تو قتل اس پتھروں کے شرے
کیوں اس میں تیری زندگی شیشہ ہیں کر آ گئی



یہاں ظلم بندوں پر جب ہو رہا تھا وہ کیوں چُپ رہا
مجھے پوچھتا ہے کہ وہ تو خدا تھا وہ کیوں چُپ رہا

فلک تک نہ پہنچا اگر بے نواؤں کا نالہ کوئی
یہیں ایک طوفانِ آب و ہوا تھا وہ کیوں چُپ رہا

جو کمزور تھے اُن میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بولتے
مگر روزِ منبریہ جو چنچتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

اُسے اپنے جیسوں کی ایک ایک کڑت معلوم تھی
ہمارا جو خود ساختہ رہتا تھا وہ کیوں چُپ رہا



نشانہ تشدد کا جب شہریوں کو بتایا گیا
جو اس شہر میں امن کا دیتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

عدالت میں جھوٹے گواہوں کی یلغار تھی کس لیے
جو ہر بات اچھی طرح جانتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

سلیمتہ نہیں عام انسان کو بولنے کا مگر
قتیل ایک شاعر جو شعلہ نوا تھا وہ کیوں چُپ رہا

دوہا

چلی جو نار ہزار بار، دھنک پر رکھ کر پاؤں
اب کے پیراں نار کے، دیکھے بناں کھڑاؤں



مست آئو تم شہر میں، بن بن ناچتے مور
زرت کے دشمن سب یہاں کیا حاکم کیا چور



تجھ بن ہو گئی ساجنا، میں کتنی کنکال
چاندی بن کے رہ گئے، سونے جیسے بال



جانے کیونکر سہ گئی، میں برہا کی آج
جلیق آگ کے سامنے، ثابت رہے نہ کالج

پلکوں پیچھے جھومتے، اک گوری کے نین
آپ رہیں نیت موج میں، ہمیں کریں بے چین



بھر بھر آہیں دُور سے، گوری کو مت چھیڑ
چلیں نہ جب تک آندھیاں نہیں کھڑتے پڑ



دل کو دل سے تول کے جو کرتے ہیں پریت
قوم قبیلہ دیکھنا، نہیں ہے اُن کی ریت



وہ زردلیٰ مزدور تھا، بھلے نہ تھا چنگیز
جس نے سمدھی سے لیا پہلی بار جہیز

کہہ کے نہ آئے بالما، اُٹھے ہے من میں ہوک
سونا ہے ہرا آگنا، کوئلیا مت کوک



کاگا زور سے بولیو، میرے منڈیرے آج
ساسن غنڈ کے سامنے، رکھو میری لاج



جہاں نہیں من شانتی، جہاں نہیں تن گیان
گھر ہو یا بن باس ہو، دونوں ایک سہان



نستی تو میں ہو جاؤں گی، پر یہ مجھ بت؟
پہلے اگر میں مر گئی، بھلے گا تُو بھی کی؟

پورب پچھم دُور دُور رادوں کا ہے نام
ریتا جی سے پُوپھیے رام ہیں پھر بھی رام



بھرے پُرسے سنسار میں جب بھی ملے کانت
پیادیا کے جا پ سے، من کو رکھے شانت



کسی کی ٹوٹیں چوڑیاں کسی کا بنے سہاگ
کبھی یہ دُنیا روگ ہے کبھی یہ دُنیا راگ



ٹکھ پائے یا ڈکھ سے، مار لے یا جیت
دھرم چکور کا پریت ہے، کرے گا چاند سے پریت

رہے کبھی نا ایک سا گھٹتا بڑھتا چاند
پیاد کا ویسپ سدا جلے پڑے کبھی نا ماند



پت جھڑکے بہار سے، پگلی یہ مت جھول
سدا نہ لہکیں ڈالیاں سدا نہ مہکیں پھول



پتھر مارے پیڑ کو، جب کوئی کھیلن مار
رک جائے تب پیڑ پر، چڑیوں کی چہکار



جُڑا سا ہے ہر آدمی، اک دُوجے کے سنگ
الگ الگ سب صورتیں، لہو کا ایک ہی رنگ

یوں نینوں کو چین دے، اُس گوری کا روپ
جیسے چیت بساکھ کی، گرم گلابی دھوپ



اپنے ہی گھر ساٹوری، کاٹ رہی بن باس
رستہ ملن کا روک لیں، کبھی نند کبھی ساس



سُندر نار چدر کی، جس کا باپ اچھوت
چوڑے اُس کے پاؤں کو، پنڈت جی کا پُرت



یہ پیسہ کیا چیز ہے، کھلے نہ اس کا بھید
جب آیا مرے ہاتھ میں، کرنے آیا چھید

کتے سونے ہو گئے، اپنے چیت بساکھ
کبھی تھے آگ ہی آگ ہم اب ہیں راکھ ہی راکھ



کبھی تولے پر میسور، کر پوری مری آس
میں بھی لکھوں شکنتلا، بن کر کالی داس



سانچ، ہمارے راج میں، کھٹے کوئی قاتل
منتر لویو تم گاڑ دو، اس کے ہاتھ میں کیل



دُوب مرا رک آدمی، آس اُمید سمیت
نکلے جب ہر سیپ سے، موتیوں بیلے ریت

منت بریکار میں بیٹھو، بے گن منش کے پاس
وہ اک پھول کی پاس کا جس میں رنگتے باس



آئی جھولا جھولنے، گوری پیا کے سنگ
چُنری میں لہرا گئے، دھنکے ساتوں رنگ



اُس نے گھونگھٹ کھول کر کی جب پیار سے بات
اور بھی روشن ہو گئی پچیت کی چاندنی رات



اک پل بھی اب چین سے لیا نہ جائے سانس
پی پن جو بھی سانسوں بنے گلے کی پھانس

سب کی میلی آنکھ ہے سب کے من میں کھوٹ
ساجن میرے پیار کو، چاہیے تیری ادھ



جب چاہے منہ پھیرے دیکھے صبح نہ شام
جیون ہے وہ بیسوا، دغا ہے جس کا کام



کاٹھ کی ہنڈیا بانوڑی کا ہے کرے غرور
بھسم کرے گی جھوٹ کو، سچ کی آگ ضرور



جُروں سے میٹھے بول کی دیکھو کم کم آس
نیم کی یہ نمکولیاں ان میں کہاں مٹھاس

زرگن کب گنوان تھا، لوگوں دیکھتے جب او
لوہا بیچ نہ پائے گا، وہ سونے کے بھاؤ



جب کہیں پورے تول کے، باقی رہنے باٹ
بکری مل کر شیر سے، پانی پیے کس گھاٹ



بوجھو ہم میں کون ہے ایسا پاگل شخص
بڑا لگے جسے آئینہ، دیکھ کے اپنا عکس



برسیں کسی پہ بدلیاں لگے کسی گھر آگ
اپنے اپنے لیکھ ہیں اپنے اپنے بھاگ

آج نیا اک چٹکلا، ہم نے سنا قتل
کوٹا بھیل کو پی گیا، ہاتھی لے گئی چیل



شہروں میں کیا شہر ہے ہری پور اک شہر
جہاں روپ کی بارشیں برسیں آٹھوں پہر



جب تپتے لاہور میں چڑھے مہینہ چیت
آئیں یاد قتل کو، ہری پور کے کھیت



لندن ہو یا ماسکو، ترکی ہو یا شام
سب سے پیارا ہے مجھے ہری پور کا نام

ماضی میں اس شہر نے، بہت کیا ناشاد
گئی نہ پھر بھی ذہن سے ہری پور کی یاد



جوڑیں رشتہ پیار کا، ہری پور کے ساتھ
نرگس، جگنو، کوئلیں، تہریں اور باغات



گندم پی مشین کی، کھائے سب لاہور
پن چکن میں جو پیسے، اُس کا مزا کچھ اور



قریرہ قریرہ جھوٹے، خوبانی کے پیسٹ
جانے کون بلاؤں نے، جڑ سے دیے اکھیڑ

آپ رہیں سب عیش سے، بھوکے نریں کمان
شالا سدا جیٹیں ہرے ہری پور کے خان



یارب کبھی نہ ماند ہو، میرے شہر کا روپ
بہتر تپتی پھاؤں سے، جس کی ٹھنڈی ٹھوپ



تیری کیا ہے شاعری، کنول ہٹاں اک بھیل
شاعر دہے انگ کا، تو کیوں بنا قلیل



کیس جے عبدالرحیم، وہ خانوں کا خان
دوہے لکھ کر بن گیا، کوتاہ کی پہچان



ہم نے اُردو شاعرو، خوب دکھایا کام
میر کی لمبی بحر کا، دو ہار دکھ دیا نام



کہتے اس کے ماترے، یہی نہ جانے کو
دوہے کی گت دیکھ کے، دیا کبیرا رو



پڑھ لے مرزا صاحبان، غور سے جو اکبار
وہ دوہے کے وزن میں، کبھی نہ کھائے مار



غزل کہو تو میر سی، مجھ سا گیت کہو
دوہے، لکھو کبیر سے، ورنہ چُپ رہو

رباعی



کس مُنہ سے کہوں میں ہوں ثنا گر تیرا
 دکھنا نہ گیب رُوئے منور تیرا
 اُس روز میں کملاؤں گا شاعر جس دن
 لفظوں میں بس سکوں گا پیکر تیرا



جتنے بھی حسدا ہیں انہیں پہچانتا ہوں
 اپنے سے بڑا کب انہیں گردانتا ہوں
 ہاں جس نے ترا حُسن کیا ہے تخلیق
 بس وہ ہی خدا ہے میں جسے مانتا ہوں



دیتی رہی جو اُس کی ہم نشینی خوشبو
 معلوم نہیں کس نے وہ چھینی خوشبو
 مے بھاگا ہے شاید کوئی جاتا موسم
 وہ اُس کے بدن کی بھینی بھینی خوشبو





دلدار کی مانند نہیلی کی طرح
تو مجھ سے ملے یار، پیلی کی طرح
راک روز کھلے دل سے بغل گیر تو ہو
ملے گا ترا حسن چنبیلی کی طرح



جانم، یہ رسیلی یہ کٹیلی آنکھیں
رہتی ہیں جو بے پیے نشیلی آنکھیں
ایسا نہ ہو آخر یہ ڈبو دیں مجھ کو
یہ تیری سمندروں سی نیلی آنکھیں



دیکھ اپنی اداؤں سے نہ شرمایا کر
ہر محفلِ زرتاب پہ چھا جایا کر
ست رنگا دوپٹہ نہ اگر مل پائے
تو مرن دھنک اوٹھ کے آجایا کر



رنگین کٹی، دیکش دمسرور کٹی
تھی زندگی جتنی بھی وہ بھرپور کٹی
بے کیف اگر تھی تو وہی تھی جاناں
جو عمر مری تجھ سے ذرا دور کٹی



جذبات کی راک بزم سجالے مرے ساتھ
ہر سانس میں راک دیپ بجالے مرے ساتھ
شاید کہ میں پھر سوتا رہوں حشر تک
ایک آدھ تو رت جگا منالے مرے ساتھ



جاں موت کے آویزے میں جڑ جاؤں گا
آوروں کی طرح قبر میں گر جاؤں گا
مرنے کا نہیں خوف ذرا بھی مجھ کو
غم یہ ہے کہ میں تجھ سے بچھڑ جاؤں گا





کہتے ہیں بے تاب یہ پابندی ہے
واعظ کا ہے فتویٰ کہ بہت گندی ہے
رندوں کی تواضع سے نہ چوکے پھر بھی
اللہ کی یہ حساس کوئی بندی ہے



اے کاش کچھ ایسا بھی قرینہ آجائے
ساغر کی جگہ آنکھ سے پینا آجائے
ہجرت کریں ہم لوگ جو میخانے سے
رستے میں ان آنکھوں کا مدینہ آجائے



دل پر اثر شام وہی ہے کہ جو تھا
جذبات میں کہرام وہی ہے کہ جو تھا
بے رنگی حالات پہ دل کر مرے ساتھ
روتا ہوا اک جام وہی ہے کہ جو تھا



تو آئے تو جنت مرا گھر ہو جائے
یہ عمر سہولت سے بسر ہو جائے
ہم میں تو دلوں کا ہے وہ رشتہ جانناں
تو روئے تو دامن مرا تر ہو جائے



کچھ لوگ تو مرتے ہیں قضا کے ہاتھوں
کچھ زہرہ جہالوں کی ادا کے ہاتھوں
لیکن مجھ تیرے لیے ڈر ہے یا شیخ!
مر جائے گا تو صبر و رضا کے ہاتھوں



اک رند کو ناراض نہ کر اے ساقی
پھر غم کا آفت زہ نہ کر اے ساقی
بولیں گے مرے حق میں ترے جام و سہو
مجھ کو نظر انداز نہ کر اے ساقی





محفوظ پس نقاب تو بھی تو نہیں
کانٹے ہیں جو ہم گلاب تو بھی تو نہیں
واعظ ترے اعمال پر سب کی ہے نظر
ناواقفِ احتساب تو بھی تو نہیں



تُو صاحبِ اعجاز نہیں ہو سکتا
تجھ پر تو ہمیں ناز نہیں ہو سکتا
کرتا رہے کائیں کائیں کوتاہ رفت
کوئل کا ہم آواز نہیں ہو سکتا



دنیا کی ہر اک شے سے محبت ہے عظیم
واعظ نہیں کر سکتا دلوں کی تقسیم
ستوار چلائے کر چھری سے کاٹے
پانی تو نہیں ہو گا کسی طرح دو نیم



اے حضرت واعظ تری باتوں کے شار
جن سے یہاں تکفیر کی چھائی ہے بہار
ہو سکتا ہے یہ تیرے سوا کس کا کام ؟
بارانِ فتاوتے ہے یہاں موسلا دھار



نظرت ہی نہیں فن بھی حسیں ہے میرا
مداح ہر اک ماہ جیہیں ہے میرا
واعظ کی بھلا بات میں سہ لوں کیے
واعظ کوئی معشوق نہیں ہے میرا



تُو عقل کے گُر ان کو سکھاتا کیوں ہے
لوگوں میں مہبم اپنا گنوتا کیوں ہے
چہرہ ہو کسی کا تو نظر آئے عکس
بے چہروں کو آئینہ دکھاتا کیوں ہے





ٹوٹی ہوئی بانہی میں وہ بس لیتا ہے
بھوکا ہو تو کچھ روز ترس لیتا ہے
اس پر بھی نہیں سانپ کو ڈستا کوئی سانپ
انساں مگر انسان کو ڈس لیتا ہے



آئندہ نہ آنکھوں سے اٹھاؤں گا غلات
کر دے یہ حطاً اسے مرے اللہ معاف
یہ دیکھ مرے ماتھے پہ تازہ راک زخم
بولا ہوں میں فرسودہ رواجوں کے خلاف



کاٹا ہوا تن سے یہ گھر کس کا ہے
ٹوٹا ہوا جیون کا سب کس کا ہے
کچھ تم ہی بتاؤ عشق پیشہ لوگو!
یہ ریل کی پٹری پر لہو کس کا ہے



سوکھا ہوا پتہ جو گرا ڈالی سے
اک پردہ اٹھا زلیست کی پامانی سے
چھا جاتی ہے جس وقت بہاروں پہ غزال
رونے کی صدا آتی ہے ہریالی سے



آفتاب میں جنت کا نشان ہے عورت
غارت گر فردوس کساں ہے عورت
آدم سے کہو، اتن پریشان نہ ہو
جنت وہی دھرتی ہے جہاں ہے عورت



عورت نہ کسی سے بھی یہاں کم ہوتی
شعلوں میں گندھی ہوئی وہ شبنم ہوتی
مردوں کے معاشرے نے بڑھنے نہ دیا
ورنہ یہی حکمران عالم ہوتی





کچلا ہوا شیطان ملا بھی تو کیب
اپنا اُسے عرفان ملا بھی تو کیب
عورت کے بدن کی دلربائی کھو کر
گو تم کو جو زردان ملا بھی تو کیب



آباد اسی نے دل کی وادی کی ہے
تاریخ نے اکثر یہ منادی کی ہے
عورت کی بڑائی کا یہ کافی ہے ثروت
عورت سے پیہروں نے شادی کی ہے



نظروں میں دھنک گھولتے دیکھائیں نے
سوچوں کی گرہ کھولتے دیکھائیں نے
وہ مسیری ہر اک بات پر خاموش رہا
حسن اُس کا مگر بولتے دیکھائیں نے



دُہرائی ہے یادوں نے کمانی اُس کی
آنکھوں میں ہے تصویر پُرانی اُس کی
وہ لوگ بتائیں گے قیامت کیا ہے
جن لوگوں نے دیکھی ہے جوانی اُس کی



لمحوں کا نشانہ کبھی ہوتا ہی نہیں
وہ صیدِ زمانہ کبھی ہوتا ہی نہیں
ہر عمر میں دیکھا ہے دکھتا وہ بدن
سونا تو پُرانا کبھی ہوتا ہی نہیں



نور جلوہ حسنِ ازلی ہو جاتا
پستل سے میں سونے کی ڈلی ہو جاتا
گر اُس کی جگہ کرتا پرستش رب کی
میں اپنے زمانے کا ولی ہو جاتا



راجہ رسلگہ بیدی، استاد داتن،
خواجہ غور شیدانور اور فیض کے لیے
جو ایک کے بعد ایک ہم سے جدا ہو گئے



اُچڑے ہیں دلوں کے باغ باری باری
خالی ہوئے سب ایوان باری باری
تھی روشنی میخانے میں جن کے دم سے
گل ہو گئے وہ چیدار باری باری



ہر چہند کہ پہلے بھی چھڑا موت کا راگ
لگتی رہی لفظوں کے محلات میں آگ
جس روز مگر جلی ہے بیدی کی چست
اُس روز تو ٹٹ گیا کافی کا سہاگ



کب جھوٹے موسم کی فضا میں دے گا
کیا پیار سے اب کوئی صدائیں دے گا
اس جس کے ماحول میں ہم لوگوں کو
داتن کی طرح کون ہوائیں دے گا



خورشید تھا وہ فن کو ضیہ دیتا تھا
ہر تان سے اک دیپ جلا دیتا تھا
کیا سرسوتی اُس سے چھپاتی چہرا؟
وہ سرسوتی سر کو بن دیتا تھا



غنجہ تو گیس شیم باقی ہے ابھی
اک سلسلہ قدیم باقی ہے ابھی
کچھ کم نہیں فیض کا بچھڑنا، لیکن
صد شکر یہاں ندیم باقی ہے ابھی





دل سے وہ کبھی دُور نہیں ہوتا ہے
مر جائے تو دھڑکن میں لکیریں ہوتا ہے
ہو شخص حسینوں میں جیا ہوتا مرگ
اُس شخص کا مرنا بھی حسین ہوتا ہے



جس سے ہو محبت کوئی کرنے والا
وہ شخص نہیں ہوتا پکھڑے والے والا
جب کوئی حسین بین کرے لاشے پر
اک بار تو جی اٹھتا ہے مرنے والا

خماسی

برادر گرامی قسیر ثنائی صاحب !

استلام ملین

ایک بے نام صنف یعنی رباعی پر ایک مصرعے کے اضافے کے ساتھ آپ نے جو تجربہ کیا ہے وہ بے انتہا کامیاب رہا ہے۔

یہ عرض لکھنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ کی معلومات کے لیے عرض کروں کہ یہ صنف بے نام نہیں ہے۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ایران میں رباعی پر اس قسم کے تجربے ہوئے اور وہ اس طرح تھے۔

۱۔ رباعی سے ایک مصرعہ کم کر کے اسے ثلاثی کا نام دے دیا گیا۔ بہارے ہاں لوگ جو ثلاثی لکھتے ہیں وہ اس بے ثلاثی نہیں کہلاتی جاسکتی کہ اس تجربے کو پہلے ہی ثلاثی کا نام دیا جا چکا ہے چنانچہ ثلاثی میں مصرعوں کی وہ نظم ہوئی جو رباعی کے وزن پر ہو۔

۲۔ رباعی پر ایک مصرعے کا اضافہ کر کے اُسے ”خامس“ یا ”پنج گانہ“ کا نام دیا گیا۔



۲۔ رباعی پر دو مصرعوں کے اضافے سے جو صنف ایجاد ہوئی اُسے
”شش گانہ“ کہا گیا۔

۳۔ رباعی پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا گیا تو اُسے ”ہفت گانہ“ کہا گیا۔

مجھے خیال آیا کہ آپ کی نظر سے شاید فارسی کی جدید شاعری کی تاریخ اور
خاص کرنے تجربات کی تاریخ نہ گزری ہو اس لیے یہ چند باتیں لکھ رہا ہوں۔ شاید
آپ اس صنف کو ”خاصی“ کا نام دینا پسند فرمائیں جو نہایت مناسب ہو گا اس لیے
کر ثنائی اور خاصی رباعی ہی کے وزن پر ہیں۔

نیاز مسند :

ڈاکٹر ایاس عشقی

محترم عشقی صاحب !

سلام شوق

یہ درست ہے کہ جدید فارسی کے نئے تجربات کی تاریخ میری نظر سے نہیں
گزری اس لیے — غ۔ ”آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔“ آپ
سے پہلے بھی چند احباب نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں اس صنف کو ”خاصی“ کے نام
سے پیش کیا کروں۔ اب آپ کا بھی یہی مشورہ ہے تو یہیجے سر درست ”خاصی“ ہی کے
عنوان سے بے نام سخن پارے حاضر ہیں۔ لیکن مجھے اتنا اور بتا دیجیے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد
اڑسٹھ برس کے عرصے میں کبھی اُردو شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے ؟

مخلص ،

قتیل شفا



ہٹ جائیں نہ دُنیا سے کہیں حُسن و جمال
صحرائے بدن پر برس اے ابر وصال
اس بات کا اب تک نہیں کیا تجھ کو خیال
جس دشت میں پیاسا کوئی مرجھاتا ہے
اس دشت میں چلتی ہی نہیں بادِ شمال



مذہب تھا مگر جنوں کا دھندا ہی تھا
حق گوئی کا کار و بار مسند ہی تھا
کیا شے تھا عقیدہ ایک پھندا ہی تھا
دی جس کو انا الحق کی سزا دُنیا نے
وہ بھی تو خدا کا نیک بندہ ہی تھا





راتیں تھیں حسینؑ دن تھے سہانے لوگو
یہ بات کوئی مانے نہ مانے لوگو
تم نے تو سنے سارے فسانے لوگو
تم جانتے ہو کیا تھی جوانی اُس کی
اُس شہرِ طرب کے اے پُرانے لوگو



جذبات کی رو میں نہ اگر بہہ جاتے
ہم کانپے کو اک پھول اُسے کہہ جاتے
بہتر تھا کہ دُور اُس سے کہیں ہ جاتے
کچھ زہر سے کم نہیں اب اُس پھول کی باں
کانٹے کی چھین ہوتی تو ہم سہہ جاتے



پینے کا جب ایستام کرتا ہوں میں
سب کے لیے اذنِ عام کرتا ہوں میں
ہر شام یہ نیک کام کرتا ہوں میں
پر زہد کی اُتری نہ ترے رُخ سے نقاب
اے شیخ تجھے سلام کرتا ہوں میں



حالات کو سدا گار کرتے کرتے
ماحول کو خوش گوار کرتے کرتے
سامانِ وصالِ یار کرتے کرتے
پتھرا سی گئی ہیں بری آنکھیں لوگو
اک شخص کا انتظار کرتے کرتے





سوچا تھا وہ خوش جمال آجائے گا
اُس کو مرا جب خیال آجائے گا
پسینم شب وصال آجائے گا
درویش تھامیں یہ نہ خبر تھی کہ اُسے
شاہوں کی طرح جلال آجائے گا



ہاتھوں کے سبھی سنگار چھوڑ دیے
یہ رقص کے انداز بگولوں جیسے
ریشم سا بدن گال میں چھوڑ دیے
اُس جانِ عزیز کے ہیں خدو خال قتل
موزون شر کے اصولوں جیسے



نظرت کا حسیں طعم تم بھی دیکھو
ہرکا ہوا اُس کا جسم تم بھی دیکھو
خوشبو کا بھسم راسم تم بھی دیکھو
جو پھول جوانی کی حرارت سے کھلیں
اُن پھولوں کی خام قسم تم بھی دیکھو



اُس بُت سے جو رسم و راہ کرتا ہوں میں
سب لوگ کہیں گستاہ کرتا ہوں میں
اس بات پر جب نگاہ کرتا ہوں میں
دل کہتا ہے دلبروں سے کیسے نہ ملوں
واعظ سے بھی جب زباہ کرتا ہوں میں





ہم وہ ہیں جنہیں زندگی پہچانتی ہے
اک راہنما وہ ہمیں گردانتی ہے
ہم جھوٹ بھی کہہ دیں تو وہ سچ جانتی ہے
یہ سب ہے حقیقت تو بتا اے دنیا
تو بھی کسی عاشق کو ولی مانتی ہے؟



تھا مجھ پہ چکنے کو اک ایسا غور شید
ہونی تھی نئے وصل کی جس سے تہسید
پوری نہ ہوئی میرے لیے جب یہ نوید
دریافت کیا میں نے تو معلوم ہوا
حالات نے کر دیا محبت کو شہید



جذبات کو بے قرار دیکھائیں نے
احساس کو اشکبار دیکھائیں نے
نظروں کا یہ حال زار دیکھائیں نے
اپنا ہی نظر آیا وہ مرستہ مجھ کو
جس شہر میں جو مزار دیکھائیں نے



رودادِ شکستِ ذات پوری کر لوں
گھٹتی بڑھتی حیات پوری کر لوں
باقی ہے ذرا ہی بات پوری کر لوں
واعظ، ترا فرمان سر آنکھوں پہ، مگر
پہلے یہ گزرتی راست پوری کر لوں





اُجھا ہوں تری زُلفت کے بل میں جاناں
رقصاں ہے تُو ہی میری غزل میں جاناں
زنت رہنا اسی رنگِ محل میں جاناں
جس دن سے ہوا تُو مری سوچوں میں شریک
صدیوں کا سفر طے ہوا پل میں جاناں



ساون کی جھڑی گیت سُناتی آئی
ماحول کو رنگین بناتی آئی
جو بوند بھی آئی گُلفِ تِی آئی
آواز مجھے دی جو کسی بادل نے
تو بہ میری حِمام کھنکھناتی آئی



بکلی میں پُرافشاں ہے اُجالا اس کا
بادلِ نظر آتا ہے دوشالا اس کا
پھر اس پر غضب ہے قد بالا اس کا
چھڑ جائے کہیں ذکرِ قیامت تو قلیل
دیتے ہیں دُعاں لوگ حوالا اس کا



اُس شخص کے پیرہن کی باتیں کر کے
رنگینی و بانکپن کی باتیں کر کے
مکے ہوئے اک بدن کی باتیں کر کے
گھٹنا نظر آتا ہے غمِ زلیست کا بوجھ
اُس راحت جان و تن کی باتیں کر کے





اپنے ہی نشے میں چور آنکھیں اس کی
منجیدہ و پُر عسدر آنکھیں اس کی
میرے لیے نور نور آنکھیں اس کی
تاہندہ ستاروں سے فلک پر جا کر
ہلکتی ہیں کہیں مزدور آنکھیں اس کی



وعدے کی بس ایک شام باقی ہے ابھی
ہاں وصل کا اہتمام باقی ہے ابھی
اک قرض میرا اُس کے نام باقی ہے ابھی
میخانے کے میخانے لٹکھائے لیکن
اُس جسم کا ایک جام باقی ہے ابھی

رفتگال

مولانا صلاح الدین احمد
فیض احمد فیض
ساحر لدھیانوی
شکر تونسوی
اکبر لاہوری

مولانا صلاح الدین احمد

یاد پھر آئی ہے اُس کی لے دل
جس نے بخشی تجھے پہلی دھڑکن
جس نے چنکائے گھنے ستارے
جس نے پہنائی لہو کو جھانجھن

جس کا سایہ یہ چمکتی ہوئی رُت
جس کا پر تو یہ ترنم، یہ ہمار
جس کے ہمراہی صبا کے جھونکے
جس کا ہم رقص، بہاروں کا وقار

ہر قدم جس کا نشان منزل
یاد پھر آئی ہے اُس کی لے دل



سپنوں کا بنجارہ — فیض

وہ ایک ایسا شخص تھا
 جس کے لیے
 بس ایک رائے سب کی تھی
 ”پیارا — بہت پیارا ہے وہ
 سپنے سہانے پیار کے
 بانٹے جو گاؤں گاؤں میں
 ایک ایسا بنجارہ ہے وہ“

وہ کہ مَر کر بھی امر ہے یارو
 ہم اُسے یاد کیے حبائیں گے
 ہم بھٹلائیں گے تو قرطاس و قلم
 اُس کی عظمت کی قسم کھائیں گے

وہ افق پار کسی وادی سے
 ہم کو آواز دیے جائے گا
 آسمانوں کا وہ ہمسرا ہم کو
 ذوقِ پرواز دیے جائے گا

کل بھی جو ہم میں رہے گا شامل
 یاد بھر آئی ہے اس کی لے دل

”ساری زمیں جس کا وطن
سارا جہاں جس کا مکاں
سب لوگ جس کے ہم سخن
سب لوگ جس کے ہم زبان
جس نے تراشیں مسند لیں
جس نے بنائے کارواں
چل کر دلوں کی راہ سے
چھو لی ہے جس نے لکھناں“

”وہ روشنی کی کھوج میں
چلتا رہا— چلتا رہا
چہرے پر وہ گردِ سحر
کلتا رہا— کلتا رہا
وہ آنڈھیوں کے درمیاں
جھلتا رہا— جھلتا رہا
وہ زندگی کے حُسن میں
ڈھلتا رہا— ڈھلتا رہا“

وہ نغمہ خواں تھا پیار کا
وہ عشق کا ہم رقص تھا
وہ تنگدل داعظ نہ تھا
اُس میں یہی راک نقص تھا
کتے رہے اُس کو بُرا دیر و حرم
لیکن یہ رائے سب کی تھی اُس کے لیے
”پیارا— بہت پیارا ہے وہ
سپنوں کا بنجارہ ہے وہ—“

ساقی کے لیے

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

وہ اک بیمارِ غم جو زندگی بھر کم سے کم سویا

نہ وہ جی بھر کے خود سویا نہ کوئی اُس کا غم سویا

جو سویا بھی تو گویا دد گھڑی لینے کو دم سویا

مگر اب کے وہ اپنے درد کی کھا کر قسم سویا

کبھی پہلے نہیں تھی بے قراری جو اسے اب تھی

یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

اسے معلوم تھا اس کا لوہے سرد ہونے کو

کھلا تھا اس کا چہرہ آج کی شب زرد ہونے کو

دُوا تھی منتظر اس کی سراپا درد ہونے کو

نہ وہ خاطر میں لایا حسرتوں کے گرد ہونے کو

بھلا حسرت کوئی اس ناتواں پر مہرباں کب تھی

یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

جو باقی مئے تھی اس کی زندگی کے آب گینے میں

وہ مئے اُس نے ملا دی موت کے ٹھنڈے پسینے میں

پھر اس کے بعد جا بیٹھا وہ اک ٹوٹے سینے میں

اُترنا تھا اُسے دریا کے ناہموار سینے میں

وہ دریا چند برسوں سے روانی جس کی بڑھب تھی

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

غزالاں خوب واقعت ہیں کہ ماتم ہو رہا ہوگا

دوانہ مرگیا، ویرانہ اُس کو رو رہا ہوگا

وہ خود ہی جانتا تھا جو بھی غم اُس کو رہا ہوگا

مگر اب پھین سے اپنی حسد میں سو رہا ہوگا

سنا ہے جب وہ سویا مسکرا ہٹ زینت لب تھی

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

دے سکا نہ چین اپنے جسم کو
اُن گنت دلوں کا جو طیب تھا

رو رہے تھے اس کو شیخ و بدہمن
مر کے بھی وہ کتنا خوش نصیب تھا

اُس کو بھی تھا عشق ساری خلق سے
یوں قتیل وہ مرا رقیب تھا

فکر تو نسوی

فکر تو نسوی مرا حبیب تھا
میری جان سے بھی وہ قریب تھا

جس چمن میں اشتراکِ غار و گل
وہ اُسی چمن کا عندلیب تھا

بیر اُس کو تھا سیاہ رات سے
اک نئی محراب کا وہ نقیب تھا

پیار کے جواہر اس کی ملکیت
یہ ہے سب غلط کہ وہ غریب تھا

محسوس یہ ہوتا ہے
 وہ ناپتے لفظوں کا
 بے چین سمندر تھا
 وہ مست قلندر تھا
 نغمات کی خوشبو سے
 مہکائے چمن اُس نے
 جذبات کی جدت سے
 گرمائے بدن اُس نے
 لمحات کو صدیوں کے
 پہنائے برن اُس نے
 تھا شوخ بہت لیکن
 جو لفظ بھی تھا اُس کا
 آداب کے اندر تھا
 وہ مست قلندر تھا
 آتی تھی نظر اُس کے
 جذبات کی شادابی

اکبر لاہوری

وہ مست قلندر تھا —

وہ رونق ہر محفل
 وہ پیر کا شیدائی
 کرتا تھا محبت سے
 یابروں کی پذیرائی
 یاد آتی ہے جب اُس کی
 وہ انجمن سے آرائی

پھوٹی ہو اندھیرے میں
 جیسے کوئی مستابی
 اک آنکھ جو اُردو تھی
 اک آنکھ تھی پنجابی
 یارو یہ حقیقت ہے
 اس ملکِ منور میں

وہ فن کا سکندر تھا
 وہ مستِ قلندر تھا